معیار

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار

جلد ــــ ۵

نمبر ــــ ۵

مئی ۱۹۵۵ء

مدیر

نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیلِ زر اور تبادلہ زر کیلئے

دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد

ترتیب

نقشِ اوّل

تخلیقی ادب کے وصفی عناصر تین کہے جاتے ہیں۔

۱ــــ مواد (Matter)
۲ــــ اندازِ بیان (Manner)
۳ــــ حظ (Capacity to please)

مواد کی بنیاد زندگی کی حقیقتوں پر ہے۔ اندازِ بیان کی الفاظ کے انتخاب سے لیکر آہنگ تک مختلف چیزوں پر۔ اور حظ؟ حظ کا معاملہ پیچیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق جمالیاتی حس سے ہے جو ہر ایک میں کسی قدر مختلف پائی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حظ تخلیقی ادب کی ایک اہم خصوصیت ہے اسی لئے بعض لوگ تخلیقی ادب کو تفریحی ادب بھی کہتے ہیں۔ تخلیقی ادب کی بعض صورتوں میں جمالیاتی معیار کی ترکیب اتنی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ اسے بنانے کے لئے نرالے ڈھنگ کی سی چالاکی سے کام لیکر متضاد اصطلاحوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اعلیٰ پائے تک کے تخلیقی ادب میں بعض مناظر آپ کو ایسے ملیں گے جن کے دیکھنے سے آپ کو نفرت ہوگی۔ آپ وہ حصہ پڑھتے ہوئے انتہائی انقباض محسوس کریں گے۔ مگر بہرکیف وہ تخلیقی ادب کا ایک جزو ہے۔ اسپنسر کی Fairy Queen کے چند اجزا تو ملاحظہ اتنے مکروہ ہیں کہ آدمی پڑھکر لکھنے والے کے ذوق کا ماتم کرنے لگتا ہے بلکش کی دوزخ میں جو بھیانک پن ملتا ہے وہ کہیں کہیں ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ ہر گز اسے جمالیاتی حس کو تسکین دینے والا نہیں کہا جا سکتا۔ شکسپیر کی ٹریجڈیاں بعض بعض جگہ اتنی ڈراؤنی ہو جاتی ہیں کہ الحفیظ! ظاہر ہے کہ ان حصوں میں محظوظ کرنے کی صلاحیت نہیں مگر یقیناً کوئی ایسی چیز ضرور ہے جو اس صلاحیت سے بھی اعلیٰ و ارفع ہے جس کی وجہ سے ہم باوجود ان مناظر کو جن سے ہمیں کراہیت ہوتی ہے، ڈر لگتا ہے، نفرت پیدا ہوتی ہے۔ دلچسپی سے دیکھتے ہیں اور ہمارا ذہن ان میں کھو جاتا ہے۔

یہ کیا چیز ہے؟ اس سوال کا جواب مشکل نہیں، اب سے بہت پہلے دیا جا چکا ہے۔ یہ چیز قوتِ متخیلہ کو اپیل کرنے کی صلاحیت ہے۔ جس کا تعلق wit سے ہے۔ اس صلاحیت کو سمجھنے کے لئے wit کی مختلف صورتوں کا بیان ضروری ہے۔ جس طرح آدمی کے حواس پانچ ہوتے ہیں اسی طرح ذہنی قوت کو بھی پانچ حصوں میں بانٹا گیا ہے۔

۱ــــ Common wit
۲ــــ Imagination
۳ــــ Fancy
۴ــــ Estimation
۵ــــ Memory

ادب ان سب کا اظہار و استعمال چاہتا ہے۔ تب ہی قوتِ متخیلہ کو اپیل کرنے کی صلاحیت ابھر سکتی ہے۔ ان کے اجزا کے مختلف تناسب سے ادب کی مختلف صورتیں بنتی ہیں wit اور Humour میں جو نازک فرق ہے وہ اسی تناسب کے سبب سے ہے۔ غرض کہ اس کو ادب میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اب دیکھئے کہ ادب میں قوتِ متخیلہ کو اپیل کرنے کے لئے کس طرح صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس موضوع پر سب سے اچھا پہلا مقالہ ایڈیسن کا ملتا ہے۔ جس میں وہ Association of Ideas کے اصول کی مدد سے گتھی کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں قوتِ خارج کی تصاویر کو ذہن میں اکٹھا کرتی ہے جن سے ذہن ایسی تصویریں بنانے میں کامیاب ہوتا ہے جو انتہائی حسین اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ اور حظ پیدا کرتی ہیں۔ تب وہ حظ کی دو قسمیں کرتا ہے ایک ابتدائی دوسری ثانوی۔ پہلی نظر کے سامنے کی چیزوں سے متعلق ہے۔ دوسری ان سے جو نظر کے سامنے کی چیزوں کی مختلف تصویریں ذہن میں

جمع ہونے کے بعد Association of Images کے اصول پر مبنی ہیں تفصیل تو اسے لمبی چوڑی کی ہے جس کے اعادہ کا یہاں موقع نہیں مگر اتنا ضرور اعادہ کے قابل ہے کہ اس طرح ابتدائی اور شاعری کی تشریح سے وہ حقیقت پسند ی کے دو اسکولوں کے اختلافی پہلو کو واضح کر دیتا ہے اس طرح تخیل کی کارفرمائی کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آتا ہے مگر ہمیں اس پر زور دینا نہیں ہے۔ ہمیں یہاں سے ایک دوسری بحث کا آغاز کرنا ہے۔

ذہن کو اپیل کرنے کی صلاحیت ہمارے قوائے عملی پر اثر ڈالتی ہے لیکن ذہن کو اپیل کرنے والی صلاحیت اس سے مختلف ہے۔ جذبات کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ وہ قوائے عملی کو تحریک دیدے یا کچھ جذبات کو دبا دے لیکن ذہن کو اپیل کرنے کی صلاحیت خود عمل کی راہ ذہن پر کھولتی ہے۔ اور شعور خفتہ کا شانہ ہلا کر جگاتی ہے طنز و مزاح میں اسی درجہ کی ذہنی اپیل کی صلاحیت کم ہوتی ہے محظوظ کرتے کی زیادہ اسی لئے تمام اونچے درجہ کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ طنز و مزاح کا درجہ فکر انگیزی کے مقابلے میں کم ہے

علم طبیعیات میں جب کسی قوت کے مجموعی اثر کو دیکھا جاتا ہے تو صرف ایک مجموعی پیمانہ قدر پر جا بجا جاتا ہے لیکن خود اس کی تہ میں کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ خاص طور پر قوت کے ساتھ وقت Time اور فاصلہ space اسی طرح جو فنون میکانکی یا Lesser Arts کہلاتے ہیں ان میں بھی وقت اور فاصلہ اولین اہمیت رکھتے ہیں فنون لطیفہ Fine Arts کا بھی ایک پہلو ایسا ہے جو مادی وسائل کے تابع ہے مگر اس کا سب سے بڑا حصہ یعنی تخیل اس کا پوری طرح پابند نہیں کیونکہ وہ میکانکی طور پر نہیں ہے

ادب میں ذہنی اپیل کی صلاحیت اسی لئے وقت اور فاصلہ کے احساس کو کم کر کے پیش کرتی ہے۔ جس کا تعلق پانچ Units میں سے آخری دو یعنی Estimation اور Memory سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام اعلیٰ قسم کے کارناموں میں اثر انگیزی وقت اور فاصلہ کی طنابیں کھینچ کر ملا دیتی ہے۔ مجموعی اثر اس وقت اختصار کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زندگی کی بعض [illegible] شکلوں کی تفصیل سے فنکار کا میابی سے بچ کر رہ جاتا ہے۔ حواس کے مواد اور مواد کی بنیادی حقیقتوں سے متصادم ہو جاتی ہیں متصادم اس معنی میں کہ ان کا اثر پھیل کر کچھ کچھ اعتدال اختیار کر جاتا ہے۔

آج ادب میں اس مادے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جمالیاتی مناظر سے لیکر زندگی کے دوسرے پہلوؤں تک میں ایک طرح کی تفصیل پسندی پھیل گئی ہے جو اکثر بے موقع ہوتی ہے اور اس لئے اس کو بے اثر بنا رہی ہے۔

یونانی ادب کی Helen of Troy آج بھی زندہ ہے مگر آج کی تمام عریاں مناظر کشی باوجود لذت پسندی کے اپنی موت مر رہی ہے۔ حالانکہ ہومر نے "ایلیڈ" میں نہ تو ہیلین کے [illegible] کی تعریف کی ہے [illegible] کی۔ نہ آنکھوں کی نہ بالوں کی نہ دوسرے اعضا کی۔ ہاں اس کے بجائے اس تاثر کو دکھایا ہے جو حسن کا اعلیٰ ترین نمونہ پیدا کر سکتا تھا۔

[illegible] Marlowe [illegible] ہے ای حیرت افروز عام تاثر کی بدولت شیکسپیر کے تمام ڈراموں سے اسی طرح زیادہ پڑھی ہوئی کہی جاتی ہیں۔ جس طرح اردو میں [illegible] غالب کے دیوان سے وہ Helen کے حسن کو تاثر کی زبان میں اس طرح ادا کرتا ہے۔

Was this the face that launched a thousand ships
And burnt the topless towers of Ilium

دور کیوں جائیے [illegible] کی مثال اس سے کہیں زیادہ روشن ہے۔

حضرت یوسف کے جمال کا اظہار تاثر کے ذریعہ کیا گیا ہے حسن کو دیکھکر حسینان مصر بے خودی کے عالم میں اپنی انگلیاں کاٹ لیں اس کا حال لفظوں کی تفصیل میں کب آسکتا ہے اور آئے بھی تو کب ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے مواد اور موضوع کے مقصد سے متصادم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حسن کے اظہار کیلئے حسن کے تاثر کو ذریعہ بنایا ہے۔ جو ایک وقت Matter کے اخلاقی پہلو اور Manner کے فنی پہلو کو کامیابی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔

ابوالمجاہد زاہد

پردہ

مجھ کو بے پردہ نکلنے پہ نہ مجبور کرو

اے مرے ہمدم و دمساز، رفیق و سرتاج
آپ کہتے ہیں کہ پردہ تو ہے فرسودہ رواج
مَیں سمجھتی ہوں کہ پردہ ہے خواتین کی لاج
شرم و غیرت کے کچلنے پہ نہ مجبور کرو

قدرِ نسوانیتِ زن کی انھیں کیا معلوم
اپنے جلوؤں کی نمائش پہ جو اتراتی ہوں
اپنی غیرت کو جو بازار میں لے آتی ہوں
خود ہوسناک نگاہوں میں اُلجھ جاتی ہوں
رنگِ پاکیزگیٔ حُسن سے جو ہوں محروم

بے حجابانہ پھروں سیر گہوں میں تن کر
میرے دمساز! کبھی ہو نہ سکے گا ایسا
اپنی عفّت کو کروں خود ہی ذلیل و رسوا
دینِ فطرت کے تقاضوں کو بُھلا کر توبہ!
میں بھی سڑکوں پہ چلوں "مردِ مؤنث" بن کر
اپنی خودداری و غیرت کو نہیں کھو سکتی
میرے سرتاج میں بے پردہ نہیں ہو سکتی

پُل صراط

تنویر احمد علوی

یہ فسردہ دلی یہ کاوشِ فکر
یہ جگر خستگی یہ عزمِ عمل
یہ تعطل یہ گرمیٔ رفتار
یہ شکستِ یقیں یہ رزمِ عمل

یہ بگولے فضائے حرماں کے
آرزوؤں کے یہ حسین محل
زندگی کی یہ راہ دُور و دراز
موت کی یہ قریب تر منزل

اِک دُھندلکے میں حال و مستقبل
ابر میں جیسے دونوں وقت ملیں
یاس کی ظلمتوں میں اُمیدیں
جیسے تاریکیوں میں پھول کھلیں

اور یہ جان و جہاں کی آویزش
جیسے پیہم نمودِ شام و سحر
یہ تگاپو یہ جستجوئے مدام
جیسے تاروں کا ناتمام سفر

ہر قدم پر نشانِ اوج و حضیض
ہر نظر میں سوادِ سود و زیاں
مُڑ تو سکتے ہیں رُک نہیں سکتے
جیسے دریا میں ایک موجِ رواں

یہ جہنم ہے اور یہ فردوس
وسط میں یہ بساط ہے اے دوست
دھار سے تیز بال سے باریک
زیست اِک پُل صراط ہے اے دوست

فاروق بانسپاری

آفتاب اور شاعر

خدا کی رحمتیں نازل ہوں خورشیدِ سحر تجھ پر
ضیا باری سے روشن کر دیا سارا جہاں تو نے

ستارے بن گئے شبنم کے قطرے سبزہ زاروں میں
زمیں کو لا کے پہنا دی قبائے آسماں تو نے

رگوں میں آتشِ سیال بن کر موجِ خوں دوڑی
افق پر لیں کچھ اس انداز سے انگڑائیاں تو نے

دلِ پژمردۂ عالم کو سوزِ زندگی دے کر
شعاعوں سے کیا محکم نظامِ جسم و جاں تو نے

عرب کی روح جاگی پردۂ چشمِ عجم اٹھا
جہاں کے قافلوں کا جانبِ منزل قدم اٹھا

بہارِ لالہ و گل کے حسیں جلوے نظر آئے
نقوشِ زندگی صحنِ گلستاں میں ابھر آئے

طلسمِ خواجگی ٹوٹا فضائے بحر و بر بدلی
جبینوں پر شکن آئی غلاموں کی نظر بدلی

دلوں میں ولولے پیدا ہوئے ارمان جاگ اٹھے
فرنگی نیند کے ماتے ہوئے انسان جاگ اٹھے

بہار آئی چمن میں رنگ پر سوزِ نہاں آیا
قفس کے رہنے والوں کو خیالِ آشیاں آیا

زمیں پر تو نے ہر سو فیض کا دریا بہایا ہے
اندھیرا میری دنیا میں ابھی تک آہ چھایا ہے

اسے بھی اپنے جلووں سے ذرا پُر نور کرتا جا
مری تقدیر کی تاریکیاں بھی دور کرتا جا

- مسلماں اپنے سینے میں لئے رُوحِ جہانداری
ابھی تک ہے گرفتارِ طلسم ہیچ مقداری

اُمیدِ لطف میں مغرب سے رسم و راہ رکھتا ہے
ستم یہ ہے کہ سینے میں دلِ آگاہ رکھتا ہے

مسلط ہے کلیسائی قیادت دیندار وں پر
حقیقت رقص کرتی ہے توہم کے اشاروں پر

(آفتاب)

مری محفل میں چھیڑی مسلموں کی داستاں تو نے
ستم کی اِنتہا کر دی ستم کے نوحہ خواں تو نے

- غضب ہے حیف بے غیرت سمندر اِتنا ہو جائے
کہ پانی کے لئے شبنم کے آگے ہاتھ پھیلائے

یہ کیا اندھیر ہے خُمِ طالبِ مئے ہو پیالوں سے
مسلماں زندگی کی بھیک مانگے مرنے والوں سے

زمانے کو بدل دینے کی قوت ہے کے بار دمیں
خود اپنا وزن کرتا ہے زمانے کی ترازو میں

سمجھتا ہے جسے تو عالمِ بیدارئِ انساں
وہ اِک خوابِ پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں ناداں

یہ شانِ ارتقاء یہ پستیٔ کردارِ انسانی
لباسِ حق میں باطل کر رہا ہے جلوہ افشانی

وہ آزادی کہ انسانوں کو جس نے کر دیا حیواں
بصد معصومیت اپنی تیرہ کاری پہ ہے نازاں

سرِ محفل یہ عُریاں رقصِ نسوانی کے نظارے
جھکی جاتی ہیں عصمت کی نگاہیں شرم کے مارے

درونِ شرعِ مغرب اتّباعِ اہرمن جائز
سرِ بازار شغلِ اختلاطِ مرد و زن جائز
شراب و رقص کی مستیوں کا بانکپن جائز
زبوں کاری کی ہر لعنت بنامِ علم و فن جائز
معاذ اللہ یہ الطافِ تہذیبِ کلیسائی
پرستارِ جہالت بن گئی انساں کی دانائی
ستم ہے دیدہ ور فرعون کو موسیٰ سمجھتے ہیں
سرابِ روشنی کو طور کا جلوہ سمجھتے ہیں

عوامی دور میں ہے شہریاری دردِ سر اب بھی
کرم فرما ہے چنگیزی باندازِ دگر اب بھی
حصولِ حق کا اونچا جتنا پرچم ہوتا جاتا ہے
طلسمِ خواجگی اتنا ہی محکم ہوتا جاتا ہے
کٹی گو پاؤں کی بیڑی کمی آئی نہ الجھن میں
پڑا ہے اب طلائی لعنتوں کا طوق گردن میں
رہائی پانے والے کلبۂ احزاں میں پہنچے ہیں
جو نکلے چاہ سے وہ مصر کے زنداں میں پہنچے ہیں
تری دنیا نہ جب تک تابعِ دینِ خدا ہوگی
ترقی جس قدر ہوگی وہ پستی کی بنا ہوگی
فراست کے پجاری تا بہ کے خنجر اٹھائیں گے
جو اک فتنہ دبے گا لاکھ فتنے سر اٹھائیں گے

زمانہ سازِ فطرت کا نہ جب تک ہمنوا ہوگا
جو نغمہ لب پہ آئے گا وہ آہِ نارسا ہوگا

ثروت میرٹھی

رباعیات

دوست کی مرضی

بلبل کی طرح نالۂ پُر غم کیسا
شبنم کی طرح گریۂ پیہم کیسا
جب دوست کی مرضی ہے مسرت کا مدار
پھر دل کی تمناؤں کا ماتم کیسا

آدمی کا چاہا

پیدا وہی ہوتا ہے جو یہ بوتا ہے
لیکن کبھی پاتا ہے کبھی کھوتا ہے
قانون یہی ہے، آدمی کا چاہا
ہوتا ہے کبھی، کبھی نہیں ہوتا ہے

ظاہر و باطن

اللہ کی رسول کی ہزاروں قسمیں
کر جائیں جہاں کو ہضم اگر ہو بس میں
سر وقفِ سجود، ہاتھ مصروفِ دعا
دل نذرِ فریب مکر ہے نس نس میں

خدا ترسی

نیکی میں بدی میں فرق کرنے والے
سچائی کے راستہ پہ مرنے والے
دولت سے حکومت سے کسی طاقت سے
ڈرتے نہیں اللہ سے ڈرنے والے

دوزخ اور جنت

دونوں کا پتہ بتا رہی ہے قدرت
دنیا دوزخ ہے اور نہ جنت ثروت
راحت نہ ہو جس میں ہے وہ دوزخ دوزخ
آفت نہ ہو جس میں ہے وہ جنت جنت

سعید عقاب

تصنیفاتِ اقبال

ضربِ کلیم

مشعلِ راہِ صداقت ہے تری "ضربِ کلیم"
تیرا نغمہ گلشنِ اسلام میں مثلِ نسیم
چاک کر کے پردۂ اسرارِ ہستی وخودی
ہو گیا تو عرشِ اعلیٰ کی بلندی پر مقیم

بانگِ درا

ہو گیا پھر جادہ پیما کارواں اسلام کا
بن گیا تیرا ترانہ مرکزِ بانگِ درا
زندگی کے ساز پر نغمہ خودی کا چھیڑ کر
زندۂ جاوید بزمِ دہر میں تو ہو گیا

بالِ جبریل

نکتہ ہائے دور رس کی روح "بالِ جبریل"
ہو نہیں سکتا کسی کو اس میں کچھ بھی قال و قیل
تو نے درویش اور سلطاں کو مساوی کر دیا
تیرا اک اک شعر ہے اس امر کی روشن دلیل

پیامِ مشرق

رفعتِ تہذیب اور اخلاقِ مشرق کا پیام
شانِ مغرب کو کیا مشرق کی عظمت کا غلام
گوئٹے دیوانِ مغرب کا مصنف ہے اگر
ممبرِ مشرق کا تو بھی ہے اک اعلیٰ ترا امام

اسرار و رموز

اک مقدس خواب کی تعبیر اسرارِ خودی
جس کے پردے میں نہاں ہے غیر فانی زندگی
عالمِ تخئیل کی جھکی ہوئی فردوس ہے
نام جس کا رکھ دیا تو نے رموزِ بیخودی

متین طارق

عزمِ محکم

میری ہر بات زمانے کو بُری لگتی ہے
کیونکہ میں کہہ نہیں سکتا ہوں زمانہ لگتی
مجھکو آتا نہیں لوگوں کی خوشامد کرنا
مجھ سے ہوتے نہیں غیروں کے دروں پر سجدے
مجھ سے آتی نہیں بیکار کی اوچھی باتیں
میری محفل میں نہیں حرص و تصنّع کا گذر
میری دنیا میں نہیں غرض تمنّا کا پتہ

مجھ کو معلوم ہے دنیا کا یہ دستور عجیب
نام لیتا ہے صداقت کا بڑا جرم یہاں
صاف گو ہوتے ہیں اغیار کی تلخی کا شکار
حق کے اظہار پہ پھانسی کی سزا ملتی ہے
ہاتھ الفت کے بہانے سے قلم ہوتے ہیں
پردۂ امن میں جرأت کی زباں کٹتی ہے

لیکن اے دوست مرا سر بھی کٹے جان بھی جائے
میں تو حق بات زمانے سے کہے جاؤں گا

محمود شاہد بکادری

اردو ادب میں تنقیدی قدریں

قدیم اردو ادب میں تنقیدی رجحان

یہ حقیقت کسی مزید غور و فکر کی محتاج نہیں کہ زندگی ایسی اکائی ہے جس کے بکھرا اجزا ایک دوسرے سے مربوط انفرادی وجود رکھتے ہوئے بھی آپس میں تنظیم و ارتباط رکھتے ہیں یعنی زندگی کلیت پسند ہے اس کا خارجی و داخلی وجود ایک ہی جوہر کی دو نمایاں تصویریں ہیں ان کے خد و خال میں بظاہر فرق محسوس ہوتا ہے مگر دراصل ایسا ہے نہیں یہ الگ بات ہے کہ کائناتِ دل کی کتنی ہی دنیائیں ہیں۔ جن پر عقل انسانی کا آفتاب طلوع نہیں ہوا اس میں کتنے پرستان خوابیدہ ہیں جہاں کی لیلاؤں کو رام کرنے کی فکر میں انسان کوشاں ہے اس لئے اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی قبل از وقت ہے مگر اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑیگا کہ اس دنیا کی کما حقہٗ دریافت نہیں ہو سکی ہے اس لئے اس کی اہمیت ہے وجدانیت کا فلسفہ سرے سے بے معنی نہیں وہ اپنے اندر وزن اور حقیقت رکھتا ہے انکار کرنے والے ہزار منہ بسورا کریں۔ جذبات کی حسین موجیں اس بحر بیکراں سے اٹھتی ہیں عقل کی شادابی فکر کی تازگی کوئی شک نہیں انہیں بہاروں کی رہینِ منت ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے ہاتھوں میں زمام حیات نہیں اگرچہ کبھی کبھی اور کسی مقام پر زندگی پرواز کے لئے انہیں سے طاقت بال و پر لیتی ہے۔ میرے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس اہم پہلو کو زندگی کے نگارخانے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چاہے ایک مادہ پرست اس کو "نہاں" کہکر ٹال جائے بہرحال یہ نہال ہی کیا کم ہے یہ چند جملے اس لئے لکھنے پڑے کہ ایک طبقہ اس طرف سے افسوسناک حد تک گریز کر رہا ہے۔ اس تجزیے کے بعد کہ انسان کی اپنے داخلی اور خارجی پہلوؤں میں تقسیم نہیں بلکہ تسلسل حیات کی دو کڑیاں ہیں جو اپنے لطف و کرم سے اس عالم کو اجالا ہے اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹ رہا ہوں یعنی ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے اور تعلق کی نوعیتیں کس دور میں کیا رہی ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ادب میں نظریہ کی وہی اہمیت ہے جو زندگی میں نظر کی ہے۔ یہ جملہ اس بات کی قطعی نفی کر رہا ہے کہ فن کو برائے فن ہونا چاہئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بھلا اس خیال کے لوگ بھی ہونگے اور اگر بدقسمتی سے ان کا وجود بھی ہو تو یہ امر اور بھی حیرت انگیز ہے کہ اس بھرپور زندگی کے دور میں جب انسان کا انہماک نوے شباب پر ہے وہ تھوڑی مدت میں محنت کر کے زیادہ سے زیادہ نتائج کا خواستگار ہے افکار و خیالات سے لیکر عقائد اعمال، محبت و شفقت، اخلاق و معاشرت ہر چیز میں اس کی مشغولیت یکسوئیت کارفرما نظر آرہی ہے۔ ادب کو زندگی کی حدود سے کیسے نکال باہر کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ ایک معیاری ادب پارے کی تخلیق میں کافی غور و خوض اور محنت درکار ہے ظاہر ہے یہ نظریہ ہمارے لئے مفید نہیں۔ ادب کا زندگی سے رابطہ کوئی نیا نہیں۔ بالخصوص اردو ادب میں اس کا سراغ لگا لینا کچھ مشکل نہیں کیونکہ اس کی عمر ابھی زیادہ نہیں کہ اس کے بارے میں الجھنیں پیش آئیں یہاں وہ فنکار بھی جس کی فنی زندگی کا ماحصل تمامتر زندگی کا عیش اور تمدد ہے وہ بھی سماج کے اثرات سے بیگانہ نہیں رہ سکا ہے اس کے فن میں ماحول کے چھینٹے اور قدروں کی پرچھائیاں بآسانی پہچانی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ اگر اردو ادب کے ابتدائی سرمائے پر نگاہ ڈالیں جس کی فضاؤں میں زلف و ابرو کی گھٹائیں ہی گھٹائیں ہیں جس کے سامنے کوئی اونچا تصور نہیں نالہ و نغمہ ہے مگر حسن کا نفسیاتی تجزیہ عشق کا مطالعہ اس دور کی شاعری کا مال ہے دھڑکنیں ملیں گی لیکن غیر مہذب جیسی سنائی دیں گی مگر عظم وہاں کی نشتر زنی نہ ہوتی کہیں ان ٹوہ میں بلندی نظر آئے گی۔ اس زمانے کی خزینے میں معاشرتی گمراہیوں کی مالی سسکیاں سنائی دیں گی مگر عام طور پر یہاں صالح قدروں کا گذر نہیں تاہم وہ اس قابل نہیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے اس دور کے ادبیاتی سرمایہ میں بڑی حقیقتیں ملتی ہیں بلاشبہ وہ ایک تمدنی و سیاسی زوال کا المیہ ہے۔ لیکن تعجب ہے وہی دور ہمارے ادبی و فنی عروج کا آئینہ دار بھی ہے۔ تخلیق کی گرمی فن کو آب و تاب عطا کرتی ہوئی ملتی ہے بہتر سے بہتر کہنے کا ارتقائی جذبہ ملتا ہے

پھر جب سامراج آیا تو جہاں ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا وہیں ہندوستان کو صنعتی و سائنسی جد و جہد کا شعور بھی ملا یہ الگ بحث ہے کہ انگریز ہندوستان نہ آتے تو نئی دنیا میں اس کا کیا مقام ہوتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریز نے ہمیں ذہن و فکر سے کام لینے اور اس کو تمدنی ترقی میں حصہ لینے کے قابل بنایا۔ مگر یہ انجانی دوستی اس کے وسعت ظرف کا نتیجہ نہیں بلکہ ہندوستان کی سیاسی حیثیت اور اندرونی بے چینیوں نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا بہر حال پہلی تحریک آزادی کی ناکام کوشش اگرچہ بڑی اندوہناک اور دہشت انگیز تھی لیکن اس نے شعر و ادب پر بڑے خوشگوار اثرات چھوڑے اسے فکر انگیزی ذہنی وسعت خیالات و جذبات کو سمونے کی صلاحیت بخشی غالب اس دور کے گوناگوں تجربات کی عکاسی کرتے ہیں وہ برسہا برس کی بساط تہذیب الٹ جانے پر ماتم کناں ہیں لیکن مایوس نہیں۔ انھیں آنے والے دور کی نشانیوں کا سچا شعور تھا وہ سمجھتے تھے کہ ملک نئی صبح کی گود میں پہنچ چکا ہے جہاں نئے تقاضے ہیں، علم و فن کی دنیا میں چراغ نہیں بجلی کے قمقمے ہوں گے۔ لیکن غالب اس سے مرعوب نہیں وہ اپنی تہذیبی غیرت ثقافتی مزاج کو غبار کی طرح دامن سے جھاڑ دینا نہیں چاہتے انھیں اس سے اُنس ہے یہ موقع نہیں کہ غالب کے بارے میں کچھ کہا جائے اور ان کی فلسفیانہ شاعری پر تبصرہ کیا جائے لیکن جب تک یہ تاریخی تسلسل ذہن میں تازہ نہ کر لیا جائے اس وقت تک موجودہ ادب کی تبدیلیوں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ موجودہ ادب زندگی سے مضبوط تعلق رکھتا ہے اس کا ابتدائی سرا ادب میں دور تک نظر آتا ہے۔ جس کی طرف ہلکا اشارہ اوپر کی گذارشات میں کر دیا گیا ہے اس نے یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ پرانے ادب نے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں لی وہ محض تفریحی سامان تھا البتہ ہمیں پرکھنے اور جانچنے کے معیاروں پر نظر رکھنی چاہئے مارکسی عینک لگا کر غالب۔ سر سید۔ آزاد۔ حالی۔ شبلی کے ادبی کارناموں میں جنس اور بھوک کا حل تلاش کرنا اور اسی انداز پر تنقیدی جائزہ لینا نہایت ہی مہمل خیال ہے ان کا صحیح اندازہ اور قدر و قیمت جاننے کے لئے ان شخصیات کا مطالعہ ضروری ہے۔ سر سید کے خلوص میں کلام نہیں مگر ان کے خلوص پر گفتگو کی گنجائش ہے وہ حاذق ہیں مگر نباض نہیں۔ وہ مغربی قومیت کے پجاری ہیں اس لئے کہ انھوں نے سارا اور ایک قوم کی مادی اور دنیاوی خوش حالی پر زور دیا تاکہ اس قوم کے زیادہ سے زیادہ افراد کاسۂ گدائی لے کر سامراج کے در دولت کو کھٹکھٹاتے پھریں اور اسی لئے قوم کے فعال عناصر صرف شکم سیری کے عوض اپنی تہذیبی وراثت کو ہمیشہ کے لئے بیچ دیں۔ کاش سر سید ایک قوم کے نہیں پوری انسانیت کے ہوتے تو ان کی قدر بھی عظیم و ہمہ گیر ہوتی اس لئے ان کے ادب میں عظمت نہیں اور جب عظمت نہیں تو عظیم انسانیت کے لئے مفید نہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ انھوں نے ادب کو سیاسی و سماجی، اخلاقی، تعلیمی خیالات سے روشناس کرایا۔ آزاد و حالی، دونوں فکری طور پر مشرقی ہیں۔ دونوں کے یہاں مشرقی شرافت عالمانہ ذوق اور مفکرانہ انداز ملتا ہے۔ مغربی تقلید میں مشرقیت کی ادائیں بھی ملتی ہیں۔ حالی قوم کی زبوں حالی، اخلاقی زوال، ذہنی مفلسی، سماجی پستی پر مخلصانہ دردمندی رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ المناک منظر باہمی تعاون۔ سماجی حقوق و فرائض تحریکیت و رجائیت کے فقدان کا نتیجہ ہے وہ محبت کا درس تعاون کا سبق سخت کوشی زمانہ شکنی کا ولولہ دے کر اس بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ زندگی کے ایک خانہ کو پر کر دینے سے زندگی نکھر نہیں سکتی بلکہ سارے اجزا اہمیت رکھتے ہیں ہر ایک کے کچھ مطالبے ہیں اس کے لئے انھوں نے زبان میں وسعت پیدا کی اپنے تخیل کی لالہ کاری سے اسے حسین بنایا۔ مقدمۂ شعر و شاعری حالی کی تنہا تصنیف ہے جو ان کے نظریۂ ادب اور اس دور کے فکری میلان کو واضح کرتی ہے۔ ترکیب اور بندشوں کی چستی۔ زبان و بیان کی صحت مثالوں۔ جملوں کی صفائی عبارتوں کی شستگی، تشبیہات و تمثیلات کی شیرینی۔ فنی تنقید کی عام دلچسپیوں کو چھوڑ کر عقلی و صحت افزا قدروں کو چھیڑنے کا شعور حالی کو اپنے معاصرین کی صف سے اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچاتے ہیں۔ وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے ادب کو تہذیبی انقلاب کا شعور عطا کیا میرا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی تبدیلیوں اور سائنسی ارتقاء سے انکار نہیں کیا مستقبل کی دنیا جس حقیقت کی طرف لپک رہی تھی اس کو بجائے جھٹلانے کے اس میں اپنے لئے مقام پیدا کرنے کی فکرمندی بیدار کی اس لئے وہ ادب کو اس دور کے عام رجحان کے خلاف انسانی اور معاشرتی تطہیر و تعمیر کے لئے استعمال کرنے کی طرف پرواز و صرف کرتے ہیں اور یہی دراصل ادب کی بلندی کی ضمانت ہے وہ ادب کیا جو ایک طبقہ کے لئے پیدا کیا گیا ہو جیسے چند عیاش مزاجوں کی حمایت حاصل ہو جو اپنے خانۂ عشرت میں محض اس لئے باریاب کرتے ہوں کہ بد مستیوں کے چند لمحے کچھ دیر اور زندگی گذار لیں۔ حالی نے اس ذہن کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی یہ صرف احتجاج نہ تھا بلکہ اثباتی طور پر سرزمین ادب میں نئے طرز تنقید کی طرح ڈال کر آنے والے دور کی بشارت تھی اس لئے وہ ایک طرف اگر شان مجددیت میں نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کی بے مثال نکتہ آفرینیوں نے انھیں اردو ادب میں بابا آدم کا درجہ عطا کیا۔ حالی کے بعد شبلی نے اردو ادب کو اپنی وسعت نظر سے مالا مال کیا ان کی معلومات نے

لطف و کرم کے دریا بہائے ادب کو جوانی میں وزن و وقار سنجیدگی و تفلسف کے گر سکھائے اداؤں میں بانکپن، لب و لہجہ میں پختگی، اسلوب بیان کو تازگی اور وسعت خیال کو بالیدگی دی جو مہذب و ترقی یافتہ زبانوں میں شمار کرایا اس طرح ادب تاریخی تدریج کے ساتھ آج (الفاظ بامعنی) کے مقصدی مقام سے گذر رہا ہے لیکن یہ کسی دور کے متعلق کہنا صحیح نہیں کہ ادب زندگی سے علیحدہ رہا اقبال سے پہلے ادب میں سچے تجربات پیش کرنے اور اسے زندگی کے لئے تخلیق کرنے کی اُمنگ اور حوصلہ ملتا ہے اور حالی جیسے باشعور و مخلص انسان اس میدان کی دشواریوں کو سر کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اقبال نے حالی کے تخلیقی آتشکدہ کو اور زیادہ روشن کیا اور ان کی آنچوں میں تہذیب اور فصاحت کو سمویا اور نہ صرف ان خیالات کو عملی شکل دی بلکہ سوچا سمجھا ہوا مقصد اور ارتقا حیات کے لئے مہذب نظام کا شعوری جذبہ پیکر ادب میں بیدار کیا اس کی محدود فضاؤں کو وسعت سے آشنا کیا اس نے فکر و فن کی دنیا میں کولمبس کی طرح [illegible] زیادہ قیمتی عالم کو دریافت کیا جس میں قومی امتیاز نہیں [illegible] سرحدیں نہیں، کالے گورے کا فرق نہیں۔ طبقاتیت کا بھید [illegible] انسان اور انسانیت کا بسیط تصور ہے اس لئے اقبال عظیم ہے، یہی منبع فیض ہے جہاں سے تعمیر پسند ادب نے پاکیزہ تصورات کی کرنیں حاصل ہیں۔ جب عالمگیر بنانے کے لئے تعمیر پسند ادیب میدان میں آئے ہیں۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم ادب ہو یا جدید، سرسید، حالی، آزاد، شبلی ہوں یا اقبال غرضیکہ ہر دور میں ادب میں افادی جھلکیاں پائی جاتی ہیں البتہ کہیں مبہم اور واضح اور کہیں ہمہ گیر اقبال سے پہلے جہاں ادب کی عمارت کسی تصور و فلسفہ کی بنیاد پر قائم نہیں ہمیں جستہ جستہ تعمیری رجحانات ملتے ہیں اور قدیم تہذیب کے بہترین اُصولوں اور قوال قدروں کا اجالا ہمیں اکثر و بیشتر دکھائی دیتا ہے جو ہمارے لئے مفید ہے اور رہنما بھی اس تجزیاتی مطالعہ کے ذریعہ قدیم ادب میں تنقیدی قدروں کا خاصا مواد ملتا ہے جن کا بیشتر حصہ تعمیری ہے جو گسگیوں، برائیوں کو دور کرنے کے لئے مستقل اور پائدار ہیں اور جو کائنات کی تصدیق پر پختہ یقین نہیں رکھتا ہے اس میں عوامی تصورات اور عوامی تجربات کا صحت مند شعور رچا ہوا ملتا ہے۔ ادب انہیں خطوط پر گامزن تھا رفتہ رفتہ اصلاحی خیالات و جذبات راہ پا رہے تھے کہ اقبال پیدا ہوا اور اس نے پہلی بار ادب کی دنیا میں انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ اسی اثناء میں ایک نیا مکتب فکر وجود میں آیا اس لحاظ سے ۱۹۳۶ء ادب کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے کہ ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔

ترقی پسند ادب

یہ گروہ مجوی امنگوں اور ارادوں کو لے کر میدان ادب میں نمودار ہوا لیکن اس کی ترقی پسندی کی تمام توجہ تخریب اور تعصب کی طرف مائل رہی اس کا کلمۂ ادب "ادب برائے زندگی" ہے اور اس کا نعرہ "ادب برائے عوام" تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ادیبوں نے یہ نعرہ لگا کر زندگی اور ادب میں بڑے بڑے فتنے اٹھائے۔ انہوں نے نہ صرف فن کی غیر متوازی تعبیر کی بلکہ اسے پروپیگنڈہ کا آلہ بنا لیا۔ بالآخر ان کے تخلیق پاروں میں بڑی کمزوری آئی اور ان کی حیثیت ایک اشتہار کی سی ہو کر رہ گئی یا اگر اور زیادہ اونچے ہوئے تو الفاظ کے جہانگیری لبادے اوڑھ کر اپنی جذباتی ذمہ داریوں سے الگ ہوئے اس کی پرواہ نہیں انسانیت کیا چاہتی ہے اور موجودہ مشکلات کے حل کی کیا صحیح سبیل ہو سکتی ہے۔ زندگی کے بگاڑ اخلاق کی تباہی معاشرہ کی بدکرداری، حتیٰ کہ ایک انسان کے مختلف امراض کا اصل سبب انھوں نے یہ سوچا کہ یہ سب مادہ کی ارتقا اور اس کے عملی تصادم کا نتیجہ ہیں۔ زندگی کے عظیم پیچیدہ متضاد مسائل کا اصلی محور پیٹ ہے۔ لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ جناب اگر ایک دور کا معاشی نظام ایک ہی معیار کا تہذیبی نتیجہ پیدا کرتا ہے تو بھی آنکھیں کھول کر ذرا دیکھئے کہ صرف اسی ملک ہندوستان میں کتنے سماجی طبقات پائے جاتے ہیں اور ذرا آگے بڑھ کر سوچئے تو بیشتر ممالک تہذیب و تمدن کے اعتبار سے باہم دگر کس قدر متفاوت متضاد معیار کے مالک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکسی نقادوں کا بنیادی معیار اور ان کا مادی نظریہ ہی بہت کمزور ہے وہ جس پیمانۂ فکر سے اس وسیع کائنات و حیات کا تول کرنا چاہتے ہیں وہ بہت ہی تنگ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ لامحدود حقیقتوں کے اندازے کے لئے نسبتاً بڑے ظرف کی ضرورت ہے جو اسے اپنے اندر سمو سکے۔ اشتراکیت ذہنی و فکری اعتبار سے بہت ناقص ہے جیسا کہ ایک جگہ ترقی پسند ادب کے سرگرم ادیب سردار جعفری اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں۔

"فکر طبقاتی ہوتی ہے اور زاویۂ نگاہ بھی طبقاتی اس لئے وہی فکر صحیح ہوگی جو اپنے تاریخی زمانے میں سب سے زیادہ ترقی پسند طبقہ کی فکر رہی ہو اور اسی فکر سے ٹھیک زاویۂ نگاہ پیدا ہو گا۔

بھلا سوچئے اس انداز نظر اور زاویۂ نگاہ پر جس ادب کی پرورش ہوگی اس میں تنگی تعصب آمریت خوف و ہراس کے لئے کیا دروازے کھل جائیں گے مان لیجئے ان کے نزدیک سب سے زیادہ ترقی پسند طبقہ مزدوروں کا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں زمام اقتدار سونپ دی گئی تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اقتدار کی کرسی پاتے ہی ویسا ہی سامراجی اور اقتدار پرست نہ بن جائے گا جس کے ظلم و بربریت سے عظیم انسانیت کراہ رہی ہے۔ آج کا انسان طبقاتی بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا کسی طبقہ کی فکر خواہ کتنی ہی وسعت گیر ہو وسیع انسانیت کے مزاج کو نہیں سمو سکتی۔ جامعی تنگی باقی رہے گی اور نہ ہی ان کے مخصوص حالات، مخصوص مزاج، مخصوص سیاسی و تمدنی ضروریات کو ایک ہی سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے خصوصاً اس وقت جبکہ سانچہ کو ڈھالنے والا اس قوت و صلاحیت سے عاری ہے کہ اس ادیبوں بھری دنیا کے ایک معتد بہ حصے کے مزاج فکر دونی و جمالیاتی پہلوؤں کا صحیح تنقیدی جائزہ لے سکے اس نارسائی کو تسلیم کرنے کے باوجود اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ وہ مستقبل کی دنیا کا واقف کار اور محسن انسانیت کا سپاہی ہے خواہ مخواہ تمسخر سے زیادہ اور کس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اوپر علی سردار کا جو خیال پیش کیا ہے وہ در اصل ان کی کوئی ذاتی اپج نہیں بلکہ جہاں اور بہت کچھ قدیم ترقی پسند ادب کی بنیاد ہیں اسے نمایاں اہمیت [illegible] اس ادب کے غرض ـــــ وہی ہونا چاہئے اشتراکیت سامنے عالم [illegible] بنا چاہتا ہے۔ یعنی اخلاقی قدریں متغیر ہیں یہ اپنے معاشی دور کی پیداوار اسی کی تابع ہوتی ہیں اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ اگر کسی سماج دو میں باپ بیٹی کے جنسی تعلقات حرام نا روا قابل مذمت ہیں تو پیدا کریں اشتراکی سماج [illegible] رجعت پرستی ترقی کی راہ میں روڑا سمجھتی ہے اس لئے اس قسم کے بندھن توڑ دینا اور اس سے علی الاعلان چھٹکارا پا لینا ترقی پسندی کے عین مطابق ہے۔ [illegible] اس قسم کے رجحانات مذہب کی یادگار ہیں اسی مذہب نے عورت سے سائنٹفک طریقہ اور [illegible] پیداوار لذت اندوز ہونے کے مواقع [illegible] سے چھین رکھے ہیں اس لئے ترقی پسند ادیب کی جنگ براہ راست مذہب سے ہے ایسا طرز [illegible] غیر متوقع نہیں اس لئے اگر حیات و کائنات کے بارے میں [illegible] کی ذہنی فکر کے دور رس نتائج کا [illegible] اندازہ ہو تو یہ بات یقیناً بالکل فطری ہے۔ مارکس کا نظریۂ کائنات جو اس عالم کو بے مقصد اتفاقی عمل کا ثمرہ سمجھتا ہو اور اس کے اندر ہونے والی شکست و ریخت کو جبری عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہو اور جس جدلیاتی فلسفہ کے ڈیپارٹ کے درمیان مختلف الجنس اشیاء پس کر بجائے معجون مرکب ہونے کے اپنا وجود ہی کھو بیٹھتی ہو اس قسم کا غیر معقول نظریہ اپنی قلمرو میں کب یہ برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی ایسا نظریہ بھی برگ و بار لا سکے جو اپنے مزاج و تخیل کے اعتبار سے بالکل متضاد واقع ہو یعنی جو اس کائنات پر یقین رکھتا ہو جس کی نظر میں حادثات و انقلابات کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ہوں عالم کے متعلق غور و فکر کا یہ مقام اور فیصلہ ہی زندگی و تہذیب کے دو جداگانہ راستے متعین کر دیتا ہے۔ ان نظریات کے اثر و تشکیل و تعمیر سے عمرانی ڈھانچہ متاثر ہوتا ہے اور جو اپنے خد و خال کو نمایاں کرنے کے لئے اسی سرچشمہ سے روح حیات حاصل کرتا ہے۔ کوئی فرد ہو یا معاشرہ کیونکہ ہمارے نزدیک فرد اپنی ارتقاء کے لئے معاشرہ کا محتاج ہے بغیر کسی لگن اور نہ ہمارے تو ترقی کی صورت پذیر نہیں ہو سکتا ہے اس لئے در اصل کسی فرد یا معاشرہ کی صورت گری چند مخصوص عقائد و تصورات پر مبنی ہے فرد کے ذہنی و عملی نتائج بڑے اہم ہیں اگر عناصر تہذیب گمراہ کن تخریب پذیر ہیں تو اس انداز پر جس شخصیت کی تعمیر ہوگی بتر نیند فساد انگیز ہوگی جو اپنے مقاصد، طریقۂ استعمال میں بھی کجرو اور تخریب کن راہ پر چل پڑے گی اس طرح ایک انسان کا تخلیقی جذبہ تخریب بن جائے گا۔ چونکہ انسانی فطرت میں خیر و شر کا وجود ودیعت کی گئی ہیں اس لئے شر کا فطری جذبہ جب گرد و پیش [illegible] مواد پائے گا تو یقیناً انسانی نفسیات کی رزمگاہ میں دونوں میں کوئی بھی ایک دوسرے پر غالب آ جائے گا اسی طرح انفرادی و معاشرتی رابطہ خیر و شر کی جنگگاہ ہے اگر معاشرہ کا غالب عنصر شر پسند ہے تو تخریبی طاقتیں [illegible] میں تھوڑے دنوں تک روپوش تو ہو جاتی ہیں لیکن ان کی جڑیں [illegible] رہتی ہیں اس بیج کی فکری تخلیق در اصل اپنے اندر بڑی تعمیری و تولیدی بھرپور طاقت رکھتی ہے تحریکیت [illegible] بت کا جو بنیادی طاقت اگر [illegible] اس کائناتی قدر کے اندر [illegible] نظر آتا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی باقی رہ سکتی ہے جبکہ انسان نظریۂ کائنات و نظریۂ حیات کے مارکسی فلسفہ کے تحت تعمیر حیات و کائنات میں لگ جائے۔

آئیے [illegible] اس نظریۂ کائنات کی صداقت کا مطالعہ کریں جو مارکسی ادیب اور مارکسی نقاد کا بنیادی تصور ہے وہ کہتے ہیں کہ اس عالم کون و مکاں کی ابتداء ایک مادہ سے ہوئی ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مادہ کو

جامد اور ٹھوس ہوتا ہے پھر یہ عالم تو متحرک ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ مادہ
مادرات متحرک ہے حرکت اس کی سرشت ہے لیکن اس مرحلہ پر بھی یہ سوال اٹھتا ہے
کہ اگر مادہ گی اسی حرکت کی ترقی یافتہ شکل ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو پھر کسی دور کے خس و خ
کا ادراک کیا ہے کس لئے ایک دور دوسرے دور سے ترقی یافتہ ہے اور اس ارتقائی
عمل کو تعمیر کی راہ پر کون لگاتا ہے کیا مادہ سے اوپر کوئی ماورائی طاقت ہے؟
اس موقع پر وہ سماجی عمل میں خارجی قانون تلاش کرتے ہیں جس سے جدلیاتی
فلسفہ کے مطابق ہر ایک دور اپنے ماقبل دور کی تردید کرتا ہے۔ کیا اس عملی تضاد
سے کوئی پیمانہ بنتا ہے جو تعمیر و تخریب کی تعین کر سکے اس کے لئے کوئی واضح غیر مبہم
معیار کی نشاندہی ضروری ہے جس سے ایک انصاف پسند مزاج تجربات کے بارے
میں صالح و غیر صالح کا معیار متعین کر سکے۔ ظاہر ہے ان کے پاس اس کا کوئی جواب
نہیں یہاں بھی اگر انسان قیاسی اور فرضی بنیادوں پر تعمیری زندگی کا کام شروع کرتا ہے
تو سائنٹفک کہاں ہوا۔ نقیبیت اور معروضیت کا شعور اس میں کہاں رہ گیا اس لئے
ایک انسان اگر اپنے تجربات کا کوئی ارتقائی نتیجہ نہیں محسوس کرتا تو اس کی حیثیت
ایک ایسے بے شعور پتھر کی سی ہوئی جسے سماجی عمل کی شور و طوفانی لہروں میں بے میل و
مرام بہائے لئے جا رہا ہو اس میں کوئی طاقت نہیں کہ اپنے مضبوط اور آہنی فکر و عمل کے بوتے
پر سماج اور ایک دور کے نظام کو بدل دے یہ سماجی و جبری عمل اپنے نتائج کے اس
پہلو سے اور بھی زیادہ خطرناک تباہ کن ہو جاتا ہے کہ اس صورت میں تہذیبی و تمدنی
ارتقا میں کوئی اعلیٰ نصب العین وجہ تحریک نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسان کی ایک
حیثیت لاشعور کی سی ہے، وہ اپنا شخصی وجود رکھتا ہے وجود کی نشو و نما اس کی
انفرادیت اپنے کمال کے لئے بے پناہ حوصلہ کی مالک ہے۔ انا کی اثباتیت کا جذبہ
اور اس کی گرمی سے کوئی سینہ مشکل سے خالی ملے گا۔ یہ محرکات یعنی جذبۂ خودی
اپنے اظہار کے لئے حالات و اسباب کو ہموار بنانے کے لئے سماجی ذمہ داریوں اور
کوشش و فساد کی کمزور تنگ حمایت کرتا ہے یہاں اس سے بحث نہیں یہاں جذبۂ شخصی
تحفظ بحیثیت کی توضیح کرتا ہے تکمیل ذات کے ذرائع اور اس سے پیدا شدہ صورت
حال وغیرہ یہ بھی ایک ذمہ دارانہ عمل ہے لیکن فی الحقیقت یہ ہماری بحث سے
خارج ہے یہاں اس کے ابتدائی پہلو کو لینا ہے۔ انسان ایک بے جان لاشہ کا نام نہیں
اس کی ذات میں شعوریت کارفرما ہے جو اسے نفع و ضرر کا احساس عطا کرتی ہے۔
ضرر کا تعلق اسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ حفظ کے لئے کوشاں ہو۔ حیات
ذات کا یہ تحریکی پہلو اس کو حرکت کرنے اور مدافعانہ بعض اوقات جارحانہ عمل
کے لئے اکساتا ہے دوسرا گوشہ نفع کا ہے یہی شعور اسے قوت ترک و اختیار کی
دولت عطا کر کے تعمیر ذات کا مقصدی اور افادی نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ یہ

دونوں جذبے بنیادی اور طبعی ہیں انھیں جذبوں نے اس انسان کو جو تاریخ
کے نامعلوم ادوار میں پہاڑوں اور غاروں سے سر نکال کر اس نیلائے فطرت کو
جھانکتا تھا اسے تسخیر عناصر، فضاؤں میں تیرنے تاروں پر کمند ڈالنے کا درس
دیا اگر انسان مارکس کے نظریۂ کائنات و حیات کا نتیجہ ہوتا تو اسے اپنے آغاز و
انجام کی خبر نہ ہوتی اور مختلف تہذیبیں جو دنیا کے مختلف عہدوں میں قائم
ہوئیں اور بگڑیں اول تو وہ نظر ہی نہ آتیں یا مستقبل ہوتیں دوسرے اگر وہ مارکسی
اصول نقد کے مطابق بے جان اور لایعنی قدروں کا ڈھیر ہوتیں تو انہیں پرکھنے
اور ان کے متعلق کسی صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ اور
جب فکر و نظر کے پرانے دیپک بجھ جاتے تو آج تہذیب و تمدن کی قندیلیں
جگمگانے کے لئے ہم کہاں سے روشنی حاصل کرتے ان حسرت انگیز حقائق سے صرف نظر کر
کے ان ہمہ گیر اثرات کا جائزہ لیجئے۔ جو مارکسی فلسفہ کی گرفت میں آنے کے بعد زندگی
پر پڑیں گے جبکہ جبریت کا نقطۂ نظر انسان کے انفرادی خیالات و جذبات
کو بے قیمت بنا کر رکھ دے گا اس کو یوں سوچئے جب مارکسیت یہ کہتی ہے کہ انسان
بہ حیثیت اپنے اعمال و افکار کے سماجی عمل کے تابع ہے اور اعمال کی صحت و عدم
صحت کے بارے میں کوئی واضح قدر نہیں جس سے صالح غیر صالح میں فرق و امتیاز
نہیں ہو سکتا تو اس کے معنی ہیں کہ سماجی عمل بھی بے قید ہے۔ اس پر پابندی نہیں
اور جب وہ آزاد غیر ذمہ دار ہوگا تو پھر لازماً انارکیت ہوگی ایسے سماج میں
ایک انسان کا ہر سماجی و انفرادی کردار صرف جائز ہوگا بلکہ مارکسی نصب العین
عملاً یہی چاہتا بھی ہے ان حقائق کی روشنی میں اس دکھی انسانیت کے بارے
میں مارکسی ادیب کا یہ فیصلہ کرنا نہ ہوگا۔ انسانیت دکھی ہے، مظلوم ہے کہاں تک
درست ہو سکتا ہے یہ طبقاتی تقسیمیں بالکل فطری ہیں۔ انھیں برقرار رہنا چاہئے
استحصال اور سرمایہ دار طبقہ وہی کچھ کر رہا ہے جس پر اس کی فکر اس کا رجحان اسے
مجبور کرتا ہے یہ چوربازاری۔ رشوت خوری کیوں بری ہے۔ یہ اونچ نیچ اور نسلی
لونی امتیاز یہ حوصلہ شکن ذہنی اور سیاسی نا انصافی یہ ذہنی و قومی شر انگیز
[illegible] آخر کیوں ختم ہو جانا چاہئے ایک
امیر جسے معلوم نہیں کیسے۔ مصائب و تکالیف جھیلنے کے بعد اس دولت کو
جمع کیا وہ کیوں غریبوں میں تقسیم کر دے۔ ایک تاجر جب یہ دیکھتا ہے کہ بے بس اور
نہتے انسانوں کو تباہ کرنے سے اس کی جیب گرم ہوتی ہے کیوں اس فعل
سے باز آ جائے ایک غاصب جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں تدبیر اور جوڑ توڑ سے
دولت پر ہم آسانی سے قابض ہو سکتے ہیں تو یہ تو اس کا فطری حق ہے کیوں
نہ چھینے نقطۂ نظر کے اس رجحان کی صحیح رہنمائی کے بجائے مارکس کا بنیادی

فلسفہ اس کی پوری تائید میں ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے ذرائع پیداوار اور پیٹ کا نتیجہ ہے اور پیٹ بھرنے کا ہر ذریعہ جائز و مستحسن اور بنیادی حق کا صحیح استعمال ہے ظاہر ہے یہ بھیانک نتیجہ چاہے ترقی پسند ادیبوں کی نظر میں نہ ہو لیکن اسے کیا کیا جائے اس کی تائید انہیں کے یہاں سے ہوتی ہے۔ در اصل یہ مضحکہ خیز تخیل ایک معاشی مسئلہ تھا جسے مارکسی ادیب اور مفکرین بلاوجہ پوری زندگی کے سر منڈھ رہے ہیں اور ظاہر ہے معاش کا حصول اور بھوک کی تسکین بذاتِ خود زندگی نہیں۔ زندگی کے بے شمار مسائل کا ایک حصہ ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس بحث و تنقید نے مارکسی تنقید کے تمام فکری پہلوؤں کو اپنے دائرہ میں سمیٹ لیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ نظریۂ کائنات و حیات کے بنیادی سوال کا جو حل مارکس پیش کرتا ہے جسے ترقی پسند ادب کی حمایت کا فخر حاصل ہے ان پر اصولی تنقید سے مارکسی سماجی کے بعض نہایت ہی ہمار انسانیت کش نتائج اجاگر ہوتے ہیں۔ بحث و تنقید کے اس مرحلے میں اب ہم ترقی پسند ادب کے ایک پہلو کو لیتے ہیں یعنی حقیقت نگاری مارکسی ادیبوں کو اس پر بڑا غرہ ہے کہ انھوں نے ادب کو زندگی سے قریب کیا چونکہ ان کے نزدیک اصل وادی مادہ ہی ہے اس لئے خارج اور محسوس اہم ہے اطلاقیت سے معنی حقیقت پرست غیر ترقی پسند طاقتوں کا تیر قریب رہا ہے چنانچہ ان کے نزدیک حقیقت کا دائرہ مظاہر ہی تک محدود ہے انسان کے اندر پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ ہی اخلاقی، روحانی و جمالی جذبات کا وزن ہے بس جو کچھ ہے خارجی دنیا ہے اسی کو من و عن پیش کر دینا حقیقت کی پوری ترجمانی ہے اب آیئے بحث و استدلال کی دنیا سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں اور انسان کی نفسیاتی اور عملی زندگی میں اس کا مشاہدہ کریں مثلاً اہم مصر کے حالیہ واقعات کو پیش کرتے ہیں اور پریس، اسلام اور ادیبوں نے پوری دنیا میں کیا صرف ایک ہی اثر چھوڑا، حالانکہ واقعات ایسی نوعیت کے تھے کہ اپنی صداقت کے اعتبار سے ہر فرد کو ہمدرد ہونا چاہیے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ ان حادثات میں متضاد رائیں ہوئیں اور مختلف نتائج اخذ کئے گئے۔ کسی نے گھی کے چراغ جلائے اور کہیں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس اختلاف تاثر سے صاف عیاں ہے کہ خارجی حادثات خود اہم نہیں بلکہ ان مظاہر کو محسوس کرنے والی طاقت یعنی شعور و تفکر کی اہمیت ہے۔ شعور کا کام ہے حوادث کو جوں کا توں محسوس کرے اور تفکر کے دم سے استقراء اور تحلیل کر کے منطقی اصول پر جانچ پرکھ کر ایک خاص نتیجہ تک پہنچا اس چھان پھٹک کی قوت کو تاثرات و تجربات بالیدگی و توانائی عطا کرتے ہیں جو سمجھتے ہو کر مظاہرِ عالم اور اس کی تبدیلیوں کو سمجھے اور اس تک پہنچنے کے مخصوص ڈھنگ اختیار کرتی ہے۔ اس لئے حقیقت تو وہ ہوگی جو انسان کے من میں ڈوب کر اور کائنات دل میں اتر کر ان دونوں رازہائے سربستہ کی حقیقت کشائی کرے جو اس عالم اور انسان کی ابتدا و انتہا کا حقیقی اور سچا انکشاف کرے اور اسی حقیقت کی روشنی میں ان مظاہر کا مطالعہ کرے اس طور پر ترقی پسند حقیقت نگاری کی وہ سطحیت باقی نہ رہ جائے گی جس کے ہوتے ہوئے تہذیبی و تمدنی قدروں کی پائداری و آفاقیت کے صالح امکانات باقی نہیں رہتے۔ کیونکہ خارج پرستی ادیب سے تنقیدی صلاحیت چھین لیتی ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے آرٹسٹ کی سی ہوتی ہے جو صرف نقاش ہے۔ اچھی بری ہر قسم کی عکاسی کر دینا ہی اپنے فن کا کمال سمجھتا ہے اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ لوگ کیا تاثر قبول کریں گے یا اس سے کیا اثرات مرتب ہوں گے دوسرے لفظوں میں اسے انسان کے غم و مسرت سے کوئی دلچسپی نہیں اس رجحان کی یہ ابتدائی شکل بڑھتے بڑھتے مرارت جھلاہٹ کا شکار بھی ہو سکتی ہے اس لئے کہ انفرادیت جب انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو ماحول اور سماج اس کی تسکین و تکمیل کی راہ میں دور تک ساتھ نہیں دے سکتے۔ بالآخر جب وہ مخصوص ذہنی سانچہ اپنے کمالات کے اظہار کا سماجی توافق چاہتا ہے جو ایک فنکار کی فطری خواہش ہے تو معاشرت کا ٹکراؤ اسے پسپا کر دیتا ہے جس سے ایک ذہنی الجھن ایک انتقامی جذبہ کا بیدار ہونا غیر متوقع نہیں۔ خاص طور پر قنوطیت یا سیت ایسے فنکار کی تخلیق میں کونج پیدا کر دیتی ہے اور اس کے فضائے ذہنی پر ناکامی و نامرادی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا جاتے ہیں جو ادیب کی ابدیت کو چھین لیتے ہیں۔ اس کے ادب پاروں میں انسانیت کا صحت مند درس مفقود ہو جاتا ہے اس تحلیل و تجزیہ سے ایک بات اور بھی واضح ہوتی ہے جس کی جانب ابن فرید نے بھی اشارہ کیا۔ لکھتے ہیں: "وہ حقیقت پسندی جو صرف ظواہر کی ترجمانی کرے وہ حقیقت سے بہت پیچھے رہ جاتی ہے وہ تو خود اپنی بطلان منطقی طور پر پیش کر دیتی ہے انسانی حقیقتیں صرف اس کے خارج تک محدود نہیں اس کے باطن سے بھی تعلق رکھتی ہیں اس کے اخلاق سے اس کے وجدانات سے اس کے ادراکات سے اس کی معاشیات سے، اس کی سیاسیات سے، اس کے تمدن سے، اس کی معاشرت وغیرہ سے بھی اس کا تعلق ہے۔ اس لئے وہ حقیقت پسندی جو صرف خارج کی ترجمانی کرے۔ حقیقت پسندی نہیں ایک طرح کی بوالعجبی ہے۔ (معیار۔ تنقید نمبر)

ترقی پسند ادیب کی ادبی کاوشوں میں جو تضاد پسندی ہمیں نظر آتی ہے

اس میں دراصل ان کا کوئی تصور نہیں بلکہ وہ نظریۂ کائنات اور نظامِ زندگی جس
کی ترجمانی کو ترقی پسند ادیب اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ اسی میں تناقضات اور
پیوند کاریاں ہیں۔ وہ وحدت و ہم آہنگی جو فرد سے لے کر معاشرہ تہذیب و تمدن
میں اعتدال و توازن کی صرف آفاقی تنظیم پیدا کردے۔ اشتراکیت اس سے قاصر ہے
ان تشریحات سے ترقی پسند ادب کے ان پُر فریب نعروں کی پردہ دری ہو جاتی
ہے جو غیر صحتمند اور مریضانہ خیالات اپنے طلسمی موضوعات کے پس منظر میں رکھتا ہے
اس لئے مستقبل کا عالم ایسے ضابطۂ حیات کا منتظر ہے جو خود آفاقی ہو اور
ابدی بھی۔

تعمیر پسند اسکول

ترقی پسند ادیبوں کے بالمقابل جو ادب میں زندگی
بخش قدروں کو سمونے کے لئے اٹھے ہیں وہ تعمیر پسند ادب
کا حلقہ ہے یہ تحریک نوزائیدہ ہے لیکن پھر بھی خاصی منظم جس کے تعارف کی چنداں
ضرورت نہیں کیونکہ یہ ملک گیر ہو چکی ہے اور غیر منظم طور پر عالمی اس لئے کہ اس قسم
کے رجحانات ہر عالمی ادب کے یہاں اپنا مقام پیدا کر رہے ہیں اس موقع پر میں پھر
اپنے سابقہ الفاظ دہراؤں گا یعنی زندگی ایک اکائی ہے۔ چونکہ اس کے پھیلاؤ
اور وسعت کی تہہ میں ترتیب و وحدت کارفرما ہے۔ اس لئے زندگی کا کوئی
شعبہ ایک دوسرے کے تعاون سے بے نیاز ہو کر ارتقاء پذیر نہیں ہو سکتا یہ امداد
اس بات کا بھی ضامن ہے کہ ادب زندگی میں بیگانگی نہیں ان کے درمیان جزو و کل
کا ربط ہے۔ تعمیر پسند ادب بھی یہی طرز فکر اپناتا ہے یوں کہئے اس دور میں صرف
دو ادبی تحریکیں ہیں جنہیں ادب برائے زندگی کا مکمل شعور ہے جو اپنے اپنے
مدرسۂ فکر کے مطابق تہذیب کو وسیع معنوں میں بدل دینے کا جذبہ لیکر میدانِ
عمل میں آئی ہیں۔ میری مراد ان تحریکوں سے ترقی پسند اور تعمیر پسند مکتبۂ فکر ہیں
مقدم الذکر کے تنقیدی نظریہ پر اجمالی تجزیہ اوپر کی گذارشات ہیں آگے ہم تعمیر پسند
نظریۂ تنقید یعنی وہ اس کائنات و انسان پر کس زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالتا
ہے اور اس نقطۂ نگاہ کا فلسفیانہ پس منظر کیا ہے۔ اس پر غور کریں گے ہمارے
نزدیک اولین چیز کائنات کے موقف کی صحیح تعیین ہے ایک مادہ پرست کی نگاہ
میں تو یہ عالم خود بخود وجود میں آگیا ہے اور اس کے اندر کی ساری چیزیں ایک
اتفاقی حرکت و تحلیل کا نتیجہ ہیں۔ یہ حرکت غالب اور مقتدر اعلیٰ ہے اس کے
آگے اسباب و علل و تمدنیں نگوں سار ہیں برخلاف اس کے تعمیر پسند نظریہ ایک خدا
کا ایک حاکم تسلیم کرتا ہے جو مدبر ہے اور منتظم بھی جس نے اس عالم کو زیورِ تخلیق
سے آراستہ کیا ہے۔ ہمارا یہ تخیل مدلل ہے۔ ہم استدلال و استشہاد کی ناقابلِ
تردید قوت اس دعوے کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ بحث کے اس مرحلہ میں پھر ہم

انسان اور اس کی نفسیات کی طرف رجوع کرتے ہیں انسان کی ایک حیثیت تو
اس کی انفرادیت ہے اور دوسرا مقام اجتماعیت اور یہ بھی مسلم ہے کہ انسان
جذبات و خیالات کا پتلا ہے اس کی نفسیات کا وہ پہلو جو جذبات سے متعلق
ہے وہ گوناگوں متضاد العناصر ہے۔ محبت و عداوت، رشک و حسد، بغض و
کینہ، شفقت و نفرت اپنا اپنا اظہار چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے حرکت بغیر محرک کے
نہیں ہو سکتی اور محرک خارجی ہوتا ہے۔ جس کی تخلیق سماج میں نہیں ہوتی یہ تعین
جذبات خود وہ اساسی اقدار ہیں جن پر سوسائٹی کی تشکیل ہوتی ہے اس
مرحلہ پر مسئلہ کی یہ نوعیت بڑی اہم ہے کہ سماجی قدروں کی صحت و عدم صحت کو
نظر انداز کرکے بلند جذبات انسانی کو بلند تر اقدار کی تخلیق پر لگایا جائے کیونکہ
انہیں کی ترقی و رجعت پر سماج کی بلندی و پستی کا انحصار ہے مگر سوال یہاں یہ ہے
کہ وہ قدریں کیونکر وجود میں آئیں اور ان کی تنقید کا کیا معیار ہو اگر یہ کہا جائے
کہ انسان کے خیالات و تجربات ایسی بنیادیں فراہم کر سکتے ہیں جو ہیئت اجتماعی
کے لئے بنیادی تصورات کا کام دے سکیں تو یہاں یہ بھی اعتراض وارد ہوتا ہے
کہ کیا تجربات اور ادراک انسانی مکمل ہیں۔ کیا انسان کا ذہنی عمل اپنے ذاتی
جذباتی خواہشات سے الگ بھی ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو تقریباً تمام
ماہرین نفسیات تسلیم کرتے ہیں کہ انسان جذبات سے مجرد ہو کر نہیں سوچ سکا ہے
یہ پہلو عقل کی گرفت سے آزاد ہے چنانچہ کسی بھی مسئلہ میں وہ ان سے الگ ہو کر
نہیں سوچ سکا ہے۔ جانبداری اور خواہش کی حمایت اسے ایسے قوانین تراشنے
میں مدد نہیں دے سکتے جو ایک سماج کے لئے بنیاد فراہم کرے کیونکہ اسے سماج
اور انسانیت کے بارے میں مکمل تحقیق نہیں۔ اس لئے نظری طور پر سماج ایک
طاقت کا محتاج ہے جس کی نگاہ میں اجتماع اور فرد کا مفاد واضح ہو جسے
اشخاص و قومیں دونوں محبوب ہوں۔ ایسی طاقت کے وجود کا ثبوت ہی ہمارے جذبات و
خواہشات کا عجز و قصور اور معیار صحت کا اختلاف و تضاد ہے اس لئے ایک
ایسی مافوق الفطرت ہستی کا اقرار جو ہم سے قریب اور بعید دیکھو۔ معاشرتی قدروں
کی تعمیر اور صحت انگیزی کے لئے ناگزیر ہے اور اس کی حیثیت فیصلہ کن طاقت
کی ہو جس کی مرضیات ہی سوسائٹی کی تنظیمی بنیاد ہوں۔ ظاہر ہے وہ مرضیات
اور قوانین زمین و زمان کی تعینات سے آزاد ہوں گی کیونکہ اس کا عطا
کرنیوالا خالق الکل ہوگا۔ جس نے اس عالم کو تخلیق کیا اور اس کے لئے قوانین
بنائے۔ مزید برآں انسان کو خلق کرکے اسے اس عالم کی نیابت سونپی اسی لئے
کہ وہ ہمارے مزاج اور انداز ساخت کو خوب سمجھتا ہے اس کے اندر تعمیر
تخریب کی جو صلاحیتیں اس نے ودیعت کر دی ہیں ضروری ہے کہ اس کی

وضاحت اور پرکھ کا معیار بھی بتائے تاکہ انسان انھیں بنیادوں پر تعمیر و ترقی کے لئے جد وجہد کرے جس میں سارے انسانوں کے لئے یکساں حادیت اور مفاد کے اعتبار سے بنی نوع انسان کے لئے قابلِ قبول ہو چنانچہ تعمیر پسند نظریۂ تنقید سماجی عمل کی صحت و عدم صحت ترقی و رجعت کے بارے میں کسی ایسے قانون کو نہیں تسلیم کرتا جو ریاضی کی صداقتوں کی طرح واضح غیر مبہم ہو۔ بلکہ وہ بنیادی حل طلب مسئلہ میں اپنے خالق سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اپنے انفرادی و سماجی اعمال کی اساس اس نظریۂ خیر و شر پر رکھتا ہے جسے اس نے خدا کی طرف سے عطیہ کے طور پر قبول کیا ہے تحقیق کی اس منزل میں پہنچ کر ہمیں بڑے اہم قیمتی اصول ملتے ہیں۔ پہلا اصول یہ کہ انسان کی آزادی اس نظریۂ حاکمیت کے تحت زیادہ وسیع اور محفوظ ہو جاتی ہے اور انسان کی تقسیم کے سارے ذرائع مسدود ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسانی عقل و فکر انتشار و اضطراب کی اس زحمت سے بچ جاتی ہے جو الحادی نظریہ کے زیر اثر ہو کر اسے سماجی بے چینیوں سے اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ اس صورت میں اخلاقی بنیادیں افادیت سے محروم ہوں گی تیسرے یہ کہ فرد و ریاست کا وہ ٹکراؤ ختم ہو جائے گا جو موجودہ ازموں میں علمی و عملی شکلوں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں جس کی واضح مثالیں مشرق وسطیٰ کے وہ ممالک ہیں جن میں جمہوریت کا نام نہاد تجربہ ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ کیسے حاصل ہو۔ اس بارے میں مغربی مفکرین سوچ بچار کے جس بلند مقام تک پہنچ سکے اس کا خلاصہ موجودہ جمہوریت ہے وہ یہ کہ انھوں نے اقتدار دستور عوام کو عطا کئے۔ دوسرے لفظوں میں عوام کی رائے سے عوام پر حاکم ہو۔ بادی النظر میں تو یہ تخیل بڑا خوشنما معلوم ہوتا ہے مگر غور و فکر میں ڈوب کر اور اس کے عملی اثرات دیکھتا ہے کہ یہ تخیل جو حقیقی حدود میں جمہوریت کے نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں وہ بھی مسئلہ کا حل نہیں اس کی حیثیت [illegible] سے زیادہ نہیں۔

اس لئے جمہوریت کا دستوری ڈھانچہ بھی ان چند افراد کا نتیجۂ فکر ہوتا ہے جو مخصوص اثرات سماجی و مذہبی، مال و دولت کے بوتے پر عوامی رائے پر قبضہ کر کے اس منزل تک پہنچے ہیں اور جب ایک بار یہ چند افراد مرکزی قوت حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی قوتوں کی لامحدود وسعتیں اور غیر مسئولیت کا رجحان کسی بھی ایسی تبدیلی کو جس سے ان کے مفاد اور اقتدار پر چوٹ پڑتی ہو نہ صرف نظر انداز کرتے رہتے ہیں بلکہ انھیں عوامی قوتوں کے سر کچل دینے میں کوئی تامل بھی نہیں ہوتا۔ اس طور پر جمہوریت اور عوامی دستور کا پُر فریب تخیل اور نعرہ بڑا مضحکہ خیز بن جاتا ہے اور افراد ایک بار اپنی طاقت اور آزادی رائے کو چند ہاتھوں کی طرف منتقل کر کے طویل و نامعلوم مدت کے لئے بے دست و پا بن جاتے ہیں۔

اور ایسا ہونا نظری اعتبار سے تصور ریاست کے عین مطابق ہے کیونکہ امن امان ترقی و خوشحالی کے لئے مضبوط ریاست کا وجود لازمی ہے اور ریاست بغیر ایک مرکزی قوت کے لایعنی شے ہے۔ جمہوریت کی بڑی خرابی یہ نہیں کہ وہ عوام کی نمائندگی عملاً کرنے سے قاصر ہے بلکہ فساد کی جڑ یہ ہے کہ وہ اقتدار اعلیٰ کی باگ عوام سے چھین کر پھر مٹھی بھر انسانوں کے سپرد کر دیتی ہے جس سے فرد و ریاست کا وہ مضبوط رابطہ باقی نہیں رہ جاتا جو وحدت اللہ کے تصور ریاست میں مضمر ہے۔ توازن و اعتدال کی شکل اسی وقت باقی رہے گی جب فرد و ریاست دونوں کا کعبۂ مقصود ایک ہو۔ افراد اور ریاست کے درمیان کوئی قوت حائل نہ ہو فرد کی صحت مند ترقی سے ریاست کے رگ و ریشہ میں برابر گرم و جوان خون پہنچتا رہے، یہ تو ہوا اس کا سیاسی پہلو اس کی معاشرتی حیثیت بھی بڑی اہم ہے اوپر کی وضاحت سے ہماری ادبی قدروں کی قیمت اور اس کی امکانیت کو جانچا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح نظام عالم اور نظام حیات میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں۔ اس عالم خاک و باد کی ہر چیز میں طبعی و حیاتیاتی حقائق پوشیدہ ہیں اور انسان کی زندگی کے چند بنیادی مسائل بھی انہیں قوانین کی اطاعت پر مجبور ہیں۔

مگر انسان کا خصوصی امتیاز اور مخلوقات عالم میں اشرفیت کا رتبہ اسے شعوری اور ذہنی صلاحیتوں کے طفیل حاصل ہے جس شے میں فطرت پسندی جزو اعظم کی حیثیت رکھتی ہے وہ شے عقل و فکر کی دنیا میں پہنچ کر اگر نوامیس فطرت سے بغاوت کرتی ہے تو گویا وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتی ہے اور یہ غلطی زندگی کی تعمیر میں بڑی سنگین ہو جاتی ہے کیونکہ مسائل حیات بنیادی طور پر خلقی اور فطری ہیں اس لئے استواری کے لئے فطری اصول و معیار ہی درکار ہے جس کی برکت اصحاب نظر سے پوشیدہ نہیں سماجی زندگی کے اس انتشار کن دور میں ایک ایسا انسان جو زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کا پابند ہو اور اسے عملاً مسائل حیات میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کا جذبہ رکھتا ہے اس کی پُر یقین شخصیت اور غیر متزلزل کردار سماجی زندگی کا مثالی کردار بن سکتا ہے اخلاقی قدریں صالح ضوابط نامانوس الفاظ نہیں ہر قوم اور ملک ان قیمتی خزانوں سے مالا مال ہے مگر کیا فائدہ کیا انسانیت ان سے مستفید ہو رہی ہے۔ کیا تہذیب و تمدن کے پریشان گیسو ویران نہیں یہ سوالات نئے نہیں۔ مظلوموں کی پھٹی پھٹی نگاہیں۔ مزدوروں کے دبلے چہرے، کسانوں کے جھلسے ہوئے رخسار، ان سوالات کا ثبوت ہیں۔

ہمدردی، غمخواری گفتار سے نہیں ہوا کرتی، اعمال و کردار کی موج نسیم زندگی

کی کلیوں کو تبسم کی خوشگواری دے سکتی ہے۔ قدروں کو چنا بطور کی کمی نہیں مجھے یہ تسلیم ہے مگر میں ایک اور بات کہوں گا۔ قدریں کتنی ہی بلند و ارفع کیوں نہ ہوں جب تک ان کی پشت پر ایک عظیم طاقت کا تصور نہ ہو وہ زندگی میں سرایت نہیں کر سکتیں۔ تعمیر پسند ادیب زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کو صرف چونکاتا ہی نہیں۔ بلکہ انھیں زندہ و متحرک قدریں عطا کر کے وحدت الٰہ اور تصور آخرت کا عمل خیز، نشاط آفریں کیف آگیں جام بخشتا ہے۔ دنیا کے دوسرے نظریہ ہائے اخلاق اور اسلام کے نظریۂ اخلاق میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام قدریں دیکر الگ نہیں ہو جاتا بلکہ انہیں سماج اور فرد کے رگ و پے میں خون بنا کر دوڑا دیتا ہے۔ یہ تصور الٰہ دوسرے مذاہب سے بہت کچھ مختلف ہے۔ عیسائیت نے الٰہ کی جو تشریح کی اور اس کے عہدنامہ کو جو زندگی کے مخصوص پہلو اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اسلام کی تشریحات سے کوئی بہت منا ہبت نہیں۔ جس کی تردید قرآن نے پوری وضاحت سے کی ہے وہ ملک اور زمانے کا پابند تھا مگر قرآن نے جہاں کہیں اپنی دعوت کا بنیادی تعارف کرانے کی کوشش کی ہے تو اس کا مخاطب کوئی قوم نہ تھی۔ اس کی نظر میں ممالک کی حدیں نہ تھیں۔ کالے گورے عربی و عجمی کا تخیل نہ تھا۔ اس نے ہمیشہ بنی نوع انسان کے اجتماعی ضمیر کو مخاطب کیا۔ یہ انداز تخاطب ہی اس کی محدودیت کی نفی کرتا ہے۔ اور تمام امکانی شکوک پر تیشہ چلا دیتا ہے اور یہ اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ کہ اسلام ایک قوم اور فرقے کے چند عقائد کا نام ہے یہ غلطی بہت پرانی ہے اب اسے ختم ہو جانا چاہیئے کیونکہ اب انسان زیادہ حقیقت پسند بنتا جا رہا ہے۔ اور حقیقت کی تلاش و جستجو ہی اس دور کا طرۂ امتیاز ہے۔ موجودہ دور کی دشواریاں ہمت شکن ہونے کے ساتھ بڑی حوصلہ افزا ہیں۔ کیونکہ مغربی تصور حیات نے زندگی کے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ ترقی و تنزل کامیابی و ناکامی کے معیار میں فرق آ چکا ہے مگر لغزشیں محسوس کی جا رہی ہیں۔ زخموں کے گہرے گہرے گھاؤ بہیم اضطراب برپا کئے ہوئے ہیں انسان اپنی غلطیوں پہ نادم ہے یہ ندامت اور یہ حسینی سماج کے ہر گوشہ میں رونما ہو چکی ہے یہ رجحان انسان دوستی کے لئے خوش آیند ہے اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں تعمیر پسند ادب کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں کیونکہ انسان فطرتاً خیر پسند ہے۔ اس کی ذات کا پائندہ حصہ نفس کے وہ کوائف ہیں جو خود رفتگی اور بیخودی سے متعلق ہیں انسان کی یہی خصوصیت اسے سماجی بناتی ہے وہ مجبور ہوتا ہے کہ محبت و الفت کے میٹھے نغمے چھیڑے، آرزووں اور تمناؤں کی بستیاں آراستہ کرے۔ تہذیب و تمدن کے فانوس روشن کرے علم و تحقیق کے گلستاں سجائے یہ سب کیوں؟ اسی لئے تاکہ ان حقائق کے تعاون اور تصرف سے اپنی ذات کو پیکر کمال میں بدل دے، یہ شعوری دھارا اسے نیک بننے اور نیکی کو پروان چڑھانے۔ ایثار کرنے اور دوسروں کو قربانی کا درس دینے کی تحریک بخشتا ہے۔ وفا شعاری، فرض شناسی، امانت داری، دیانت داری، تابناک قدریں ہیں جو سماج کی ابتدائی تاریخ سے لیکر اس ترقی یافتہ دور تک مستحسن رہی ہیں۔ جس طرح اس کی قدر و قیمت سے دور حجری کے انسان نے استفادہ کیا بعینہٖ دور جدید کے مہذب انسانوں کو یہ جرأت نہیں کہ اس سے مستغنی ہو سکیں۔ یہ قدریں اٹل ہیں، ان کو زوال نہیں، وہ ایسے پھول ہیں جن کو خزاں نہیں، انھیں پھولوں کی تختہ بندی، روش آرائی تعمیر پسند ادب کا بنیادی فریضہ ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اخلاقی قدریں، ہر ملک کے انسانوں کا مرکز توجہ رہی ہیں اس لئے یہ کسی ایک قوم اور ملک کی میراث نہیں بلکہ یہ متاع گراں بہا پوری انسانیت کا متاع مشترک ہے اس لئے جو تحریک بھی ان قدروں کو لیکر اٹھے گی اس کا کام عالمی ہوگا۔ اس کے مخاطب بنی نوع انسان ہوں گے۔ بحث کے اختتام پہ ہم اخلاق کے بارے میں بھی اجمالاً کچھ کہہ دینا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر مختلف شکوک ابھر سکتے ہیں جو اخلاق کے بارے میں مختلف مکاتب فکر میں جو اختلافی شاخیں قائم ہیں۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے یہاں بنیادی طور پر دو نقطۂ نظر کی جانب اشارہ کرتا ہوں ایک ضمیریئین کا ہے جو بہت پرانا اور اپنے انداز تحقیق میں بہت کچھ ہماری توجہ کا مستحق ہے یہ مکتب فکر خیر و شر کو تخلیقی مانتا ہے۔ یعنی حاسۂ اخلاق انسان کی سرشت اور فطرت میں ہے اور محبت و الفت اتحاد، ایثار، ہمدردی و رحم، صداقت و راستبازی، دیانت و امانت فطری جذبات ہیں۔ ان جذبات کا صدور اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ خود مسرت و مادی منفعت کا ذریعہ ہیں جو تحریک کا موجب ہیں کیونکہ حسن عمل کے موقع پر ہمارے ذہن میں کوئی اس قسم کا خود غرضانہ جذبہ نہیں ہوتا اور نہ اتنا وقت ہی ہوتا ہے کہ اس پر کچھ غور و فکر کر کے نتائج کے اعتبار سے فیصلہ کیا جا سکے بلکہ وہ یکایک ابھرتا ہے۔ لیکن یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حُسن و قبح کی تعلیل اور دیگر واقع کی تعیین کیونکر ہو اس مرحلہ پر ہم اسے مابعد الطبعی امور پر چھوڑتے ہیں اور اسے عظیم طاقت کی رہنمائی میں دیدیتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ان احکامات کا ذریعہ انبیاء کو قرار دیتے ہیں جو خود اسی کام کے لئے پیدا کئے جاتے رہے ہیں۔ اس طور پر نظریۂ اخلاق کو عظیم قوت دی جا سکتی ہے اور اس کی ماہیت کو ابدی قرار دیکر پُر امن سماج کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔

اسی کے بالمقابل نظریۂ افادی ہے جو حاسۂ اخلاق کی فطریت کا منکر ہے جو یہ کہتا ہے کہ اخلاق کی بنیاد خودی یا لی المسرت پر ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ایک شخص کسی کی مدد اسی لئے کرتا ہے کہ دوسرے سے اسی قسم کے معاملہ کی صحیح توقع وابستہ کی جاسکے یا سخاوت اس لئے آدمی کرتا ہے تاکہ اس کی شہرت کی جذباتی تسکین ہو جو بذاتہ ایک مسرت ہے۔ اس طور پر گویا تمام اخلاقی اعمال اس لئے مستحق ہیں کہ ہم اس سے لطف اندوز ہوں۔ مگر اس نظریہ میں جو نقائص ہیں وہ بہت واضح اور شرمناک ہیں مثلاً اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے۔ اور خود غرضی استلذاذ نفس ایک مہذب شریف انسان کے یہاں مذموم ہے اس لئے اخلاقیت کا یہ انداز اپنے تئیں بداخلاقی پر مبنی ہے۔ اس لئے استدلال و حقائق کی دنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان دونوں مکاتب فکر کی روشنی میں جو نمایاں بنیادی فرق ہے اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ کون سا نظریۂ اخلاق ہمارا دو رنگ ساتھ دے سکتا ہے۔ تعمیر پسند ادب چونکہ بین الانسانی ادب ہے اس لئے اس کے موضوعات عالمی ہیں کام کی وسعتوں کے پیش نظر جو فنکار بھی ان موضوعات کو اپنائے گا اس کے اثرات فن پر ضرور پڑیں گے کیونکہ کسی عظیم بات کو کہنے کے لئے عظیم بننے کی ضرورت ہے ایسے فنکار کے یہاں وسعت تو ہوگی ہی عظمت فن بھی درکار ہے یہیں سے فارم اور خصائل کا کامیاب ترین اور موثر ترین طریق اظہار اپنے جذبات و تاثرات کو پُراثر بنانے کے لئے محتاج ہے۔ ظاہر ہے یہ کام کسی طرح فکری و ذہنی تربیت سے کم درجہ کا نہیں۔ ہمارے اسلوب میں جس قدر رنگ و آہنگ کیف و نشاط پیدا کیا جاسکے ضروری ہے۔ فنی طور پر ہمیں اپنے قدماء سے سبق لینا چاہئے۔ تقلید بذاتہ قبیح نہیں۔ اندھی و جامد تقلید رسوا کن ہے۔ فارم اور خصائل کی بلندی، آہنگی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے اس سلسلہ میں ترقی پسند ادب نے اقبال کے خرمن سے خاصی خوشہ چینی کی ہے۔ فن کے میدان میں ہمارے لئے بڑی وسعت ہے۔ بشرطیکہ کام کیا جائے۔ کیونکہ تخیلات و افکار کا مواد ہمارے پاس زیادہ ہے۔ موضوع کی رنگارنگی ہم رکھتے ہیں جو جدت طرازی و ندرت آفرینی کے لئے کام آسکتی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ موضوعات کو فن کا رگِ جاں بنائے جس قدر فنکار مخلص ہوگا اسی قدر فن میں آب و تاب پیدا کرسکے گا۔ کیونکہ اس کا فن خونِ جگر سے لالہ کار و تازہ کار ہوگا۔ جمالیاتی لطافت کی رنگ آمیزی بھی ہمارے لئے ضروری ہے۔ البتہ حدود کا خیال رکھنا ہوگا جمالیاتی ذوق ایک مستقل اور نازک بحث ہے اور اسے تعمیری رنگ میں بدلنا اور رکھنا کہیں زیادہ ذمہ داری کا کام ہے میرے خیال میں تعمیر پسند مصنفین میں سے کسی نے اس بحث پر کھل کر قلم نہیں اٹھایا ضرورت ہے اس پر روشنی ڈالی جائے اور تحقیق و تدقیق کے اس دروازہ کو بھی پوری احتیاط سے کھولا جائے۔

نجم الاسلام

اصغر علی عابدی — ایک تعمیر پسند قلم کار

اصغر علی عابدی تعمیر پسند ادبی تحریک کے پرانے قلم کار ہیں۔ اور شروع سے لکھ رہے ہیں۔ میں عابدی صاحب اور ان کی تحریروں کو تقسیم ہند کے کچھ عرصہ بعد سے جانتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ماہنامہ "انوار" آتا تھا تو ہم لوگ (میرٹھ کے احباب) اسے شوق اور دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ اگرچہ ہم اس کی ادبی صحت سے مطمئن نہیں تھے۔ جب بھی کوئی نیا پرچہ آتا۔ اس میں فنی اور نظریاتی گرفت کیلئے ہمیں کافی مواد مل جاتا مگر اس کے باوجود "انوار" ہمیں عزیز تھا کیونکہ اس وقت اس میں وہ نیا پن مل رہا تھا جو اور کہیں نہیں ملتا تھا۔ اور اس کو پیش کرنے میں ظاہر ہے کہ عابدی صاحب کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ عابدی صاحب ہی "انوار" کو حیدرآباد سے نکال رہے تھے۔ اسلئے عابدی صاحب ہمیں "انوار" کے لکھنے والوں میں سب سے زیادہ عزیز تھے۔

اس وقت عابدی صاحب ایک افسانوں کا مجموعہ "خطرناک راہیں" شائع کر چکے تھے۔ اس کے بارے میں میں نے سنا ہی سنا ہے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اب وہ آسانی سے ملتا بھی نہیں! اور رسائل میں عابدی صاحب کے ایک دو افسانے پڑھنے کے بعد افسانوں کا مجموعہ دیکھنے کی خواہش باقی بھی نہیں رہی ہے۔ جہاں تک میری رائے ہے۔ ان کے افسانے "شیوۂ آگہی" تو ظاہر کرتے ہیں مگر انھیں کامیاب افسانے نہیں کہا جا سکتا۔ بس یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک مدیر اور مرتب کو افسانے کے فنی پہلوؤں سے جتنی ابتدائی واقفیت ضروری ہوتی ہے اس سے ان افسانوں کا لکھنے والا حامل ہیں۔

شروع میں انھوں نے ایک دو گیت بھی لکھے ایک آدھ نظم بھی کہی مگر اس میدان کو ایک دو تجربوں کے بعد خیرباد کہہ دیا۔ اس سے ان کے خود انتقادی رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ خود کو احتساب سے بچتے نہیں۔

عابدی صاحب کے اصل جوہر مقالے کے میدان میں کھلے ہیں۔ یہاں وہ مطالعہ اور قلم کی روانی دونوں سے بہرہ ور نظر آتے ہیں۔ مواد کو سمیٹنے میں ان کا قلم رک رک کر نہیں چلتا وہ روانی سے لکھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ صحافت کا رنگ غالب ہونے لگتا ہے۔ یہ رنگ مقالات کے لئے کہاں تک موزوں ہے۔ اس پر بات چیت کا ایک دروازہ کھل سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کا زور آپ کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہے گا۔

"انوار" کا ادبیات نمبر ابھی تک بہت سے قارئین بھولے نہیں ہوں گے۔ ایک جگہ اس میں عابدی صاحب لکھتے ہیں۔

> "ایسا ادب ہمیشہ بڑے بوڑھوں اور گاؤں والوں کی رسموں، ریتوں، پنچوں، خانوں، چرس خانوں اور سیدھی جانوں میں ٹیلے۔ سارنگی کے ساتھ خوب پھڑکتا ہے۔ مگر جہاں ملکی مسائل حل ہوتے ہوں۔ بھوکوں کے پیٹ اور ننگوں کے جسم کا سوال ہو جس جگہ خود انسان انسان کے ظلم کا شکار ہو رہا ہو اور خدا کی سلطنت میں ہر طرف اس کے باغیوں کا راج ہو۔ وہاں یہ ادب اس لنگڑے لولے اور اندھے بہرے فقیر کی طرح گھسٹ گھسٹ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

یہ اقتباس عابدی صاحب کے طرز تحریر کی نمائندگی کر سکتا ہے۔ خاص طور پر اس میں آپ کو فری اسٹائل کی قسم کا انداز بیان ملے گا۔ یہ اسٹائل عام بول چال کے غیر کتابی الفاظ تک کے استعمال سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور چھوٹی تشبیہیں عام فہم انداز میں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ ایک حد تک یہ چیز اچھی ہے۔ لیکن کہیں کہیں دس میں، یا دتی ہو جاتی ہے تو تنقیدی گرفت کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ تسکین قریشی صاحب نے ادارہ ادب اسلامی میرٹھ کی ایک نشست میں ایک غزل پڑھی تھی جس کا مطلع یہ تھا:

جنونِ محبت کی راہیں بہت ہیں

یہ غزل اپریل ۱۹۵۱ء کے معیار میں شائع ہوئی۔ عابدی صاحب نے اس پر نقشِ اوّل میں لکھا ہے۔

"غزلوں میں تسکین قریشی نے مقصد کو آہستہ آہستہ ابھارا ہے۔ جیسے گاڑی کو ذرا پیچھے کرکے آگے بڑھایا ہو۔"

یہ واقعی تشبیہ غزل کے نرم و نازک مزاج پر گراں تھی۔ چنانچہ تسکین صاحب نے غزل گوئی کو گاڑی بانی کی صف میں کھڑا کرنے پر زوردار احتجاج کیا۔

یہ تو رہی طرزِ تحریر کی بات۔ اب عابدی صاحب کے ابتدائی ادبی مقالات پر ایک سرسری نظر ڈالئے۔

سب سے پہلے تو "انوار" کے اداریے ہی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں گے۔ یہ اداریئے ایک مستقل پلان کے تحت لکھے گئے ہیں۔ مثلاً کئی مسلسل شماروں میں جدید ادب پر تنقیدات کا ایک کامیاب سلسلہ ملتا ہے۔ یہ مقالات تھوڑی سی ترمیم کے بعد ایک مربوط مقالے کی صورت میں جنوری ۱۹۵۵ء کے معیار میں "مغربی ادب کے تین دور" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں جن کی افادیت آج بھی اسی طرح مسلّم ہے۔ جس طرح "انوار" کے دورِ اوّلین میں تھی۔ جس وقت ان کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ اور اس لئے کہ عابدی صاحب نے ایک ایسے موضوع پر اسلامی تنقید کے اصولوں کو منطبق کیا تھا جس پر پہلے اس قسم کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔

اس مقالے میں عابدی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے میرے خیال میں دوسرے حصوں سے زیادہ جاندار ہے۔ اور مقالہ نگار کی تاریخی واقفیت اور تحلیل صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔

تھوڑی ہی عمر میں دنیا کافی دیکھ لی ہے۔ آبائی وطن بدایوں ہے جہاں سے حیدرآباد گئے۔ حیدرآباد سے لاہور اور دہلی، وہاں سے پھر حیدرآباد اور وہاں سے لکھنؤ گئے اور اب دہلی میں مقیم ہیں۔

"انوار" انہوں نے تقسیمِ ہند کے بعد نکالا تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے وہ لاہور میں مولانا نصراللہ خاں عزیز کے اخبار کوثر میں اور اخبارِ ایمان میں کام کر چکے تھے۔ "انوار" کی ترتیب اور مضامین میں اسی صحافتی تجربہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ بعد کو یہی چیز "معیار" میں "نقشِ ثانی" سے پہلے، "اور نقشِ آخر" کے مستقل عنوانات کے تحت ظاہر ہوئی۔ اور اب "دعوت" میں اس کے جوہر کھل رہے ہیں۔

"انوار" کا ادبیات نمبر عابدی صاحب نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔ یہ نمبر یورپ کا پورا ادبی تھا۔ اور اس زمانے میں تعمیر پسند ادبی تحریک کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں عابدی صاحب کے دو تنقیدی مقالات قابلِ ذکر تھے۔ ایک کا نام میں بھول رہا ہوں۔ دوسرا "ادب میں تحریکیت" تھا۔ دونوں بہت پسند کئے گئے۔

پھر کچھ ایسے پیچ پڑ گئے کہ "انوار" کو حیدرآباد سے لکھنؤ لانا پڑا۔ اور عابدی صاحب لکھنؤ سے اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اور "انوار" کو بند کر دینا پڑا۔

بالآخر ۱۹۵۰ء کے آخر میں دہلی آ گئے۔ یہاں ان کے ایماء پر "معیار" کا اجراء کیا۔ ادارت عابدی صاحب نے سنبھالی۔ جنوری ۱۹۵۱ء سے رسالہ کا آغاز ہوا۔ مگر چھ ماہ کے بعد ہی مالیات کی دشواری نے حوصلے پست کر دیئے۔ اور وہی ہوا جو اردو کے ادبی رسائل کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ تب آب و ہوا کی تبدیلی کی غرض سے رسالہ کو میرٹھ لایا گیا۔ شکر ہے کہ یہاں ابھی تک چل رہا ہے۔ عابدی صاحب ادبی مشاغل سے ہٹ کر ایک بار پھر صحافتی میدان میں داخل ہوئے ہیں۔ آج کل دہلی سے محمد مسلم صاحب کے ساتھ سہ روزہ "دعوت" نکال رہے ہیں۔ اور اخبار میں اتنے مصروف ہیں کہ ادبی مشاغل سے کچھ کچھ دور نظر آتے ہیں۔ جو ہم جیسے ان کے بہت سے قدردانوں کے لئے وجہِ شکایت ہے۔

اب چند مقالات کا اجمالی ذکر کرتا ہوں جو عابدی صاحب کے اچھے تنقیدی مقالات میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

"ادب میں تحریکیت" کے بعد ان کا ایک عمدہ مقالہ "افسانہ کی بنیادی قدریں" ہے جو معیار میں دو قسطوں میں چھپا۔ پہلی قسط میں افسانہ کے تقریباً سبھی بنیادی مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسانہ نگار اور سماج کے تعلق پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد دو نہایت جاندار اور معلوماتی حصے آتے ہیں۔ ایک میں ہندوستان کے قدیم افسانوی ادب سے لیکر مسلمان حکومتوں کے زوال تک کی ان قدروں کی تشریح کی گئی ہے جو افسانہ میں بسی رہی ہیں۔ اس قسط کے دوسرے حصہ میں مغربی ادب کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ دوسری قسط میں جدید مغربی اسالیب کو سامنے رکھکر بعض رجحانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ افسانے ہندوستان ٹائمز میں چھپے تھے۔ اور عالمی مقابلے کے منتخب شدہ تھے حالات اور تجربات کی گردش انسان کی فکری قوتوں کو کن کن راستوں پر لے جا رہی ہے۔ اور کیسی ایسی چیزیں ہیں جو بہتر امکانات پیدا کر رہی ہیں۔ اس کا تجزیہ کرنے اور اندازہ لگانے کے لئے جتنی وسعتِ مطالعہ اور بالغ نظری کی ضرورت تھی اس کا مظاہرہ عابدی صاحب کے مقالہ میں ملتا ہے۔

دو طویل مقالات ایسے ہیں جو ادبی اجتماعات میں پڑھے گئے ہیں ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک، جامعہ ملیہ کی انجمن تعمیر پسند مصنفین کی نشست میں پڑھا گیا تھا۔ مجھے اس مقالے کو سننے کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن حفیظ صاحب سن کر آئے تھے اور اس کی بڑی تعریف کی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تعریف بجا ہی ہوگی۔ البتہ عابدی صاحب اس کا روک لینا اب تک کیوں پسند رہا ہے۔؟ یہ نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے نظر ثانی کرنے کے لئے اٹھا رکھا ہو جس کا اہتمام عابدی صاحب کے یہاں معمول سے زیادہ ملتا ہے۔

دوسرا غیر مطبوعہ مقالہ اسلامی ادب کے موضوع پر ہے جو اردو سیمونیم علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا اور بہت کامیاب تھا۔ اسلامی ادب کی تشریح کی جس نوروہاں ضرورت تھی۔ کامیابی کے ساتھ کی گئی تھی اس کی افادیت کے پیش نظر ہمیں عابدی صاحب سے اس کی اشاعت کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

اب میں کچھ باتیں ان مضامین کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں جو عابدی صاحب نے ادبی موضوعات سے ہٹ کر لکھے ہیں۔ ایسے مضامین دو حصوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) اشتراکیت کے موضوع پر لکھے ہوئے مضامین۔
(۲) بھارت کی موجودہ تہذیبی اور سیاسی کشمکش پر مضامین۔

اشتراکیت کے موضوع پر عابدی صاحب شروع ہی سے پڑھ اور لکھ رہے ہیں۔ ایک کتاب "اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں" کے مولف بھی ہیں جس میں بیشتر تراجم اور کچھ ان کے اپنے اضافے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی۔ رسائل میں بھی اس مسئلے کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

اب ان مضامین کو لیجئے جن میں بھارت کی موجودہ تہذیبی اور سیاسی کشمکش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور سے دو چیزیں پیش نظر رکھی جاسکتی ہیں۔ ایک تو مختصر سا کتابچہ "ہندوستانی سوشلزم"۔ دوسرے وہ مضامین جو وقتاً فوقتاً معیار میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کبھی "نقش ثانی" کے تحت کبھی نقش آخر کے تحت۔ ہندوستانی سوشلزم میں عابدی صاحب نے ایک ایسی مبنی بر حقیقت بات کہی تھی۔ جو آج کے حالات پر حرف بحرف صادق آرہی ہے۔ اگرچہ یہ کتابچہ اب سے کئی سال پہلے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد رہ گیا ہے اس میں سوشلزم کی اس بگڑی ہوئی صورت کا تجزیہ کیا گیا تھا جس کی طرف کانگریس چل رہی تھی۔ آج کانگریس کھل کر سوشلزم کا نعرہ لگا رہی ہے۔ اور یہ بات سچ نکل رہی ہے کہ کانگریس کیمونزم اور سوشلزم کو ماننے والی جماعتوں سے لے کر جن سنگھ اور مہاسبھا سب کی نمایندگی کر رہی ہے۔

اسی طرح کی کئی باتیں ان مضامین میں ایسی ملتی ہیں۔ جو عابدی صاحب کے یہاں نئی بات کہنے کے سلیقے کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہیں۔ چند ایک مقالات میں ہندو فلسفہ و مذہب کا تجزیہ بھی ملتا ہے۔ یہ موضوع آج کے دور میں بہت اہم ہے۔ اپنے ملک کے اکثریتی عوام کے رجحانات کو اچھی طرح سمجھے بغیر کوئی ذہنی جد وجہد اور بہتری کی کوشش اور انقلاب آفرینی ممکن نہیں، عابدی صاحب نے اس ضرورت کا احساس کیا۔ یہ خوشی کی بات ہے۔ مگر ابھی اس کا حق ادا کرنا باقی ہے۔

تخلیق سے تعمیر تک .....

سید مستفیض الحسن، ایم، اے

فن فطرت کی عکاسی کرتا ہے چاہے وہ فطرتِ کائنات ہو، فطرتِ انسانی۔ ادب فن کار اپنے مخصوص ذریعہ تخلیق سے (Medium of Expression) فطرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مصوّر موئے قلم سے حسن کی تشکیل کرتا ہے اور یہ اُس کی فنی تخلیق ہے۔ سنگ تراش پتھر کی تراش خراش کر کے مجسمہ تیار کرتا ہے اور یہ اُس کی خلقت ہے۔ معمار گارے اور مٹی کے تودوں کو عمارت کی شکل میں ترتیب دیتا ہے اور یہ اُس کی تعمیری کاوش ہے۔ شاعر اور ادیب اپنے داخلی احساسات اور خارجی تجربات کو لفظ و بیاں کے سانچوں میں ڈھالتے ہیں اور یہ اُن کا ذوقِ کار امر ہے۔ گویا فن اس تخلیق کو کہتے ہیں جو فن کار کے حساس ذہن کے کائنات پر ردِ عمل سے وجود پاتی ہے۔

تمام فن کار اپنی ذہنی صلاحیتوں سے حسی کائنات اور ماحول، مشاہدات، اور تجربات کی عکاسی کرتے ہیں اور ہر فن کار اس منصبِ تخلیق سے اپنی ذہنی ساختوں کی نسبت سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ کیوں کہ کائنات کی مصوری ہو یا انسانی مشاہدات و تجربات کی عکاسی (Imitation) فن کار کی اپنی ذہنی صلاحیتوں اور اُس کے نقطہ نظر سے جلا پاتی ہیں۔ اس اعتبار سے اُس کی تخلیقات فطرت کی ذاتی حیثیت سے تو کم درجہ کی ہوتی ہیں مگر ایک دوسرے پہلو سے فطرت کی ذاتی حیثیت سے بلند تر بھی ہوتی ہیں۔ وہ دوسری حیثیت یہ ہے کہ فن کار فطرت کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ فطرت کے سادہ عناصر کو کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ فطرت کی پسندیدہ خصوصیات اُجاگر ہو جائیں اور ناپسندیدہ عناصر پس منظر میں چلے جائیں۔ وہ اپنے مخصوص نقطہ نظر کے مطابق کائنات پر تنقید کرتا ہے اور اس انتخابیت کے مرحلے میں (Process of Elimination) فطرت کی ہیئت کو بالکل بدل دیتا ہے۔ فطرت کی یہ نئی شکل (Form) فن کار کی اپنی تخلیق بن جاتی ہے۔ یوں تخلیق کے تمام تر مراحل میں تنقید فن کار کا ساتھ دیتی ہے اور تخلیق و تنقید میں یہ وابستگی کچھ اس طرح کی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے ہم فن کا کوئی صحیح تصور قائم نہیں کر سکتے۔ فن کار کی تمام کاوشیں خواہ وہ ذہنی و فکری ہوں یا نفسیاتی اور روحانی تنقید کے مراحل میں رونما نہیں ہوتیں۔ فن کار جس تناسب سے حسن کے جلوہ سے لطف اندوز ہوتا ہے اُس کو الفاظ کے جامے میں ملبوس کر کے منظرِ عام پر لانے کے لئے وہ مثالی

عقیدے سے کام لیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فن کار کے ہاتھوں میں فطرت ایک مواد خام ہے جس کو وہ اپنے دماغی اور تخیلی عمل اور ردِ عمل سے نئی تراش کے جوہر میں بدل دیتا ہے۔

یہ بات ادب کے معاملے میں اور زیادہ صحیح ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی کی محض عکاسی نہیں کرتا، بلکہ اپنی قوتِ متخیلہ سے حیات کی ایک نئی تعمیر کر کے اُس کو فن پاروں کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ پھر ہر فن کی طرح ادب بھی بڑی حد تک مثالی (Idealistic) ہوتا ہے۔ وہ موجودہ اندازِ حیات کی تاریخ پر کہ کے علاوہ حیات کے مستقبل کے خاکے بھی تیار کرتا ہے اس مقصد کے لئے وہ اپنے سماج میں نئی قدروں کے در توڑ کے بکھیرتا ہے۔ اپنے سماج کی برائیوں سے غیر مطمئن ہو کر وہ کسی ایسے نظامِ حیات کے تخیلی نقشے بناتا ہے جہاں زندگی سکون و بہجت کا پیام ہو گی۔ اس طرح ادیب قاری کے جمالیاتی ذوق کو اُبھار کر حسِ تناسب (Sense of Proportion) کو بالیدگی عطا کرتا ہے اور یہ تعمیر ہے اور قاری کے ذوقِ حسن کی ارتقا (Sublimation of the sense of beauty) کی ضامن۔

حقیقتاً ہم کسی ایسے فن پارہ کا تصور نہیں کر سکتے جس میں فن کار کی حیثیت قطعی طور پر غیر جانبدار ہو جس میں فن کار کا ذہن اور اُس کی شخصیت جھلکتی ہو۔ اصل میں فن کار کا نقطہ نظر جس سے وہ اپنے احساس اور جذبات کو نئی نئی اور نئی شکلوں میں پیش کرتا ہے اور جس سے وہ اپنے تجربات تجزیات اور تخیلات کی ترجمانی کرتا ہے فن کار کی روح ہے۔ اگر یہ روح مفقود ہے تو فن بے روح ہے اور وہ تخلیق نہیں بلکہ صرف نقالی ہے۔

ادیب کی ذہنی لیاقتیں اور اس کا نقطہ نظر بڑی حد تک اُس کے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ادیب چاہے کتنا ہی تخیل پسند ہو جائے وہ اپنے ماحول سے قطعی طور پر علیحدگی اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ اور اس کی فنی تخلیقات بڑی حد تک اُس کے ماحول کی آئینہ ہوتے ہیں۔ انسان بہر حال ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اُسے مختلف نفسیاتی تجربات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان مواقع پر ادیب

کی قوت تخلیق ان تجربات اور مشاہدات میں تنقید کی مدد سے رنگ آمیزی کرکے انھیں فن کے سانچوں میں ڈھال دیتی ہے۔ اس طرح وہ تمام جذبات میں احساسات کی تحریک بھی ذہن میں ایک سیال روپ اختیار کرلیتی ہے۔ حالانکہ خارجی تحریکات اور ذہنی تخلیقات میں کسی نہ کسی نوع کی ہم آہنگی ضرور باقی رہتی ہے۔ ادیب کے افکار اور اس کے مقاصد بھی اس کے ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور اس کا اس زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ گویا ادب زندگی کی تعبیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ادبی تخلیقات ادیب کے نقطۂ نظر کی حامل ہوتی ہیں اس میں مقصدیت کا کوئی پہلو ضرور مضمر ہوتا ہے۔ ادیب کی نگاہیں ایک مثالی مستقبل کے امکانات پر جمی ہوتی ہیں۔ آسکر وائلڈ کا قول ہے

"Literature always anticipates life. It does not copy it but moulds it to its purpose"

مگر نقطۂ نظر اور مقصد دونوں مبہم سے الفاظ ہیں اور جب تک ان کو کسی صفت سے متصف نہ کیا جائے بامعنی نہیں ہوتے۔ نقطۂ نظر اور مقصد اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی، نقطۂ نظر مقصد کا عکس ہوتا ہے۔ اس لئے مقصد کی برائی بھلائی نقطۂ نظر کی تشکیل کرتی ہے۔ اگر مقصد بھلا ہے تو نقطۂ نظر اور طرز فکر صحیح ہوتے ہیں اور اگر مقصد برا ہے تو نقطۂ نظر اور طرز فکر بھی غلط ہوں گے۔

بہرکیف فن فن کے لئے ہو یا فن تعمیر کے لئے۔ کبھی بے مقصد نہیں ہو سکتا کیونکہ فن کار کے لئے نفسیاتی طور پر محال ہے کہ وہ معاشرہ میں رہے اور معاشرہ اس معاملات و مسائل سے بے تعلق رہے جنھوں نے اس کے احساسات کو جگا کر اس کے فن کے لئے ماحول مہیا کیا ہے۔ چنانچہ ادیب اپنے مقصد کو سامنے رکھکر اپنے ماحول کی عکاسی کچھ اس طرح کرتا ہے کہ قاری ادیب کے مقصد سے متفق ہو جائے اور اس مثالی مستقبل کی تکوین کے امکان پیدا ہو جائیں جس کا ایک دھندلا سا عکس فن کار کے ذہن میں موجود ہے۔ یہ نفسیاتی مقصد اعتدال پر بھی قائم رہ سکتا ہے اور انتہا پسندیوں کی بھینٹ بھی چڑھ سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادیب جنسی گھٹن کو زندگی کا بنیادی مسئلہ تصور کرے۔ جیسا کہ بقول اقبال ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادیب سمجھے کہ انسان کی زندگی معاشیاتی محور پر ناچ رہی ہے اور وہ اپنے موضوعات کسان اور مزدور، روٹی اور طبقاتی کشمکش تک محدود کردے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادیب ادب کو انسانی سماج کی بہتر تشکیل کے لئے استعمال کرے۔ تعمیر اور اخلاقی اوصاف کی ترقی کے کام میں لائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب زندگی کی عکاسی وسیع اور بھلے مقاصد کے لئے بھی کرتا ہے اور تنگ اور برے مقاصد کے لئے بھی۔ کبھی ادب تعمیر کے لئے راہیں صاف کرتا ہے کبھی تخریب کا پیغمبر [illegible] بن جاتا ہے جو کبھی انسانیت کی زندہ جاوید اخلاقی قدروں کی طرف دعوت دینے لگتا ہے اور کبھی بہیمیت کی تاریک گھاٹیوں کی طرف بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ادیب معاشرہ کے رائج الوقت نظریات کی تائید کرتا ہے۔ ابن فریدے کسی موقع پر کہا ہے "ادب نے ہر دور میں غالب نظریے کا ساتھ دیا ہے۔ اور اسی کی ترجمانی کی ہے۔ تاریخ کے صفحات الٹ جائیے آپ دیکھیں گے کہ کبھی وہ دیومالائی رہا ہے۔ کبھی وہ جمالیاتی رہا ہے۔ کبھی درباری ہو گیا ہے اور کبھی عوامی۔ اس نے صداقتوں کی ضوباریاں بھی کی ہیں اور تاریکیوں کو بھی فروغ دیا ہے۔ اس نے اعلیٰ انسانی اقدار کو بھی جلا دی ہے اور انھیں تعفن میں بھی غرق کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی بڑی قوت رکھنے کی بنا پر بذات خود منتہا اور مقصد سمجھ لیا گیا ہے"

آج کا عالم سیکڑوں مختلف اخلاقیات معاشروں میں منقسم ہے۔ ہر نظریے کے علمبردار ادیب اپنے نظریے کے حامیوں کی تعداد بڑھانے میں کوشاں ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی دنیا میں جتنے نظریات ہیں اتنے ہی ادب کے دھارے بھی ہیں۔ گویا جس طرح دنیا کے نظریات لذت پسندانہ، قوم پرستانہ، ترقی پسندانہ اور تعمیر پسندانہ ہیں، اسی طرح ادب بھی لذت پسندانہ، قوم پرستانہ، ترقی پسندانہ اور تعمیر پسندانہ ہوتا ہے۔ اور ہر ادب معاشرہ کی تشکیل اپنے محرک نظریے کے مطابق کرنا چاہتا ہے۔ ایپی کیورس اور خیام کے پرستار چاہتے ہیں کہ ؎

عیش حاضر سے ہر اک ذی ہوش ہم آغوش ہو

یہ لوگ تلاش مسرت کے نام پر عیش کوشی اور تسکین نفس کی خاطر لکھتے ہیں اور اخلاقی ابتری اور فحاشی پھیلانے کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ مگر یہ نظریہ خود اپنی موت مر رہا ہے۔ اور اب صرف چند ادیب انفرادیت پسندی کا لبادہ پہن کر اس نظریے کی حمایت کر رہے ہیں۔ مگر یہ بھی تابکے۔

قوم پرستانہ نظریے کے حامی لوگ دو گروہوں پر مشتمل ہیں — وطن پرست اور قوم پرست۔ وطن پرستی تو ٹوٹتے ہوئے بین الاقوامی نظریے نے فنا سی کر دی ہے اور جہاں کہیں باقی ہے [illegible] ہو جائے گی۔ قوم پرستی کے ذیل میں مذہبی گروہ آتے ہیں اور قوم پرست ادیب [illegible] ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی

اپنے گروہی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ آج کا ہندوستان اس قوم پرستی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ ایک طرف ہندو قوم پرست ادیب ہیں جو تمام دُنیا کو کسی بھی قیمت پر ہندو دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف مسلم قوم پرست ہیں جو بقول سجاد ظہیر فرقہ پرستی کی حمایت کرتے اور متعصبانہ ادب کی تخلیق کر رہے ہیں۔ مگر یہ ذہنیت بھی اب لیسپائیت کی طرف ہٹ رہی ہے۔

آج کل ترقی پسند نظریات بڑے مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ "ترقی پسندی" کے معنی اصلاً یہ ہیں کہ ہر نئی او کھی شے کو خوش آمدید کہا جائے اور پرانی بات کو خیرباد کہا جائے۔ اور اس سعی میں اشیاء کی پسندیدہ صفات یا ناپسندیدہ خصوصیات سے قطع نظر کر لیا جائے۔

ترقی پسند ادب اپنا ایک فلسفہ بھی رکھتا ہے۔ اور اشتراکی نظام حیات برپا کرنا چاہتا ہے۔ اشتراکی نظام میں لذّتیت اور عیش کوشی کی بڑی گنجائشیں ہیں لہٰذا آج کی بیشتر مسرت اور عیش پسند دُنیا اُس کی طرف بڑھ رہی ہے اور ترقی پسندی کا طرّۂ امتیاز سمجھا جانے لگا ہے۔ مگر حال ہی میں تعمیر پسند نظریئے نے جنم لیا ہے۔ وہ ایک صالح نظام حیات کا داعی ہے۔ یہ نقطۂ فکر اخلاقی قدروں کے قیام پر زور دیتا ہے اور زندگی کی تعمیر و تطہیر کا علمبردار ہے۔ بات ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مذکورۃ الذکر مکاتیبِ فکر کی پیش کردہ ادب کی تعریف پر غور کیا جائے کہ کون مقصدِ انسانیت کی فلاح کا ضامن ہے۔

ترقی پسند ادیبوں میں احمد ندیم ایک ادبی شخصیت کا مالک ہے۔ اس کی زبانی ادب کی تعریف یہ ہے۔

> "ہم ترقی پسند ادیب ادب کو زندگی کا آئینہ ہی نہیں
> سمجھتے ہیں بلکہ زندگی کو بدلنے اور بہتر بنانے کا وسیلہ بھی
> تصور کرتے ہیں۔ ہم زندگی برائے زندگی، ادب برائے
> جدوجہد اور ادب برائے انقلاب کے نظریئے کو اپنی
> تحریک کا سنگِ بنیاد خیال کرتے ہیں ہماری فکری اساس
> اشتراکی حقیقت پسندی ہے۔"

اور ہندوستانی تعمیر پسند ادیبوں میں نعیم الاسلام خاصہ مقام رکھتا ہے وہ ادب کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

> "تعمیری ادب وہ ہے جس میں معروف اخلاقی رجحانات
> کا احترام ملتا ہو۔ اور جس سے بھلائیوں کا جذبہ پرورش
> پاتا ہو۔"

اور پھر معروف اخلاق کی تصریح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "تاریخی سرمایہ، تجربات کا ریکارڈ، خواہشات
> اور عقلی توجیہ، صحیح قوانین کی تحقیق و جستجو میں معاون
> تو ثابت ہو سکتی ہے لیکن اُن کو فیصلہ کُن حیثیت
> حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد آخری چارہ کار
> یہی رہ جاتا ہے کہ ہم نظامِ اخلاق کا وہ تصور
> اپنائیں جس کی بنیاد خدا پرستی پر ہو۔"

ان دونوں تعریفوں پر تنقیدی نظر ڈالئے تو اول الذکر تعریف میں کچھ باتیں تشریح طلب نظر آتی ہیں زندگی برائے زندگی اصطلاحاً شاندار نظر اور شیریں فقرہ معلوم ہوتا ہے مگر جب تک زندگی کا کوئی صحیح تصور نہ دیا جائے یہ تعریف قابلِ فہم نہیں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی ایک معروف لفظ ہے اُس کی تفہیم چنداں دقیق نہیں۔ مگر مشکل تو یہی ہے کہ انسانی فکر صدیوں سے زندگی کی تفہیم کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس کوشش میں اس نے سیکڑوں نظریات آزمائے۔ کئی مذاہب کو پرکھا۔ اور جب اس سعی میں حسبِ منشا کامیاب نہ ہوا تو علمی نقطۂ نظر (Secular Scientific Outlook) کے نام پر مذہب سے بیزاری کا اعلان کر دیا گیا۔ زندگی کی تفہیم اس قدر آسان نہیں ہے جتنی ترقی پسند ادب کی تعریف میں محسوس ہوتی ہے۔ اس تعریف میں اشتراکی حقیقت پسندی بھی جو اس ادارہ فکر کی فکری اساس ہے۔ زندگی کا کوئی صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس تعریف کے تحت زندگی کا مقصد صرف انقلاب ہے۔ انقلاب کا نعرہ کتنا ہی خوش آئند ہو مگر انقلاب کا تصور کیا ہے جب زندگی کا صحیح تصور نہیں تو انقلاب کا صحیح تصور قائم ہونا محال ہے۔ اس لئے کہ انقلاب کا تصور اپنی وضاحت کے لئے زندگی کے تصور کا محتاج ہے۔ جب تک زندگی کا کوئی معقول تصور موجود نہ ہو نہ انقلاب کا کوئی تصور ہو سکتا ہے اور نہ اس ادب کے خدوخال واضح ہو سکتے ہیں۔ جو اس مبہم تصورِ حیات کی بنیاد پر ایک انقلاب لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر بالفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انقلاب کا تصور معاشی ہمواری ہے تو بھی کوئی صحیح نظریہ مشکل سے ہاتھ آتا ہے کیونکہ آج یہ بات اشتراکیت کے روسی تجربے نے ظاہر کر دی ہے کہ زندگی صرف روٹی کے گرد مرکوز نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ اور لوازم بھی ہیں۔

نعیم الاسلام نے ادب کی جو تعریف کی ہے جس میں دو باتیں تعمیری ادب کی خصوصیات کی حیثیت سے بیان کی گئی ہیں۔ اولاً معروف اخلاقی رجحانات کا احترام اور ثانیاً بھلائی کے جذبے کی پرورش۔ فی الوقت یہ دونوں باتیں ایک ہی بات کے دو رُخ ہیں جو دو انداز میں کہے گئے ہیں۔ مگر سوال یہاں بھی وہی ہے کہ معروف اخلاقی رجحانات ہیں کیا۔ اس بات پر غور کیا جائے

تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں کوئی ایسا حاسہ ہے جو برائی اور بھلائی کی تمیز کر لیتا ہے۔ اور یہ حس کسی قوم کے افراد یا کسی ملک کے لوگوں کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ یہ بنی نوع انسان کی مشترک ملکیت ہے۔ یہ انسانیت کے ضمیر کا پرتو ہے جو ہمیشہ تمام حالات میں اور تمام ادوار میں قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے من حیث جنس ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم بعض اخلاقی صفات کو مستحسن قرار دیا ہے۔ اور بعض اخلاقی برائیوں کو مذموم۔ پس اخلاق ان ہمہ گیر انسانی قدروں کا نام ہے جو کبھی نہیں بدلتیں۔

مگر یہاں ایک اور سوال حل طلب پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر یہ اخلاقی قدریں قائم کیوں نہ رہ سکیں۔ آخر کیا وہ موانع تھے جنہوں نے ان اخلاقی قدروں کی موجودگی میں دوسرے قوانین کی تدوین ممکن کر دی۔ ان کا سبب صاحب الامر جماعتوں یا افراد کی خود غرضانہ مہمات تھیں۔ ان قدروں کے قیام کو یقینی بنانے اور پختگی دینے کے لئے آخری چارہ کار یہ ہے کہ ہم نظام اخلاق کا وہ تصور اپنائیں جو خدا پرستی پر مبنی ہو۔

ادب کی اس تعریف میں ایک مقصد کی کماحقہٗ تصریح کر کے اس کے حصول کے لئے صحیح طریقوں کی طرف اشارہ دیا گیا ہے۔ ادب کی اس تعریف میں زندگی کا مقصد بھلائی کا قیام یعنی "فلاح" بتایا گیا ہے اور فلاح کے لوازم (Implications) یہ ہیں کہ زندگی معروف اخلاقی قدروں پر قائم رہ کر تخلیق کے الٰہی منصوبے کے ماتحت راہ ارتقا میں گامزن رہے۔ یہاں یہ بات اور تشریح طلب ہے کہ ادب کا محرک اعلیٰ "توحید" ہی کیوں ہو؟ زندگی کیوں نہ ہو؟ مگر ذرا سے غور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتراض قائم نہیں ہو سکتا، کیونکہ زندگی کی تفہیم براہ راست اور بلا واسطہ ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ انسانی تاریخ بتاتی ہے۔ توحید ہمیں زندگی کی تفہیم دیتی ہے۔ اس لئے دینی ضرورتوں سے قطع نظر بھی توحید کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ کیونکہ (Plan of creation) کی تفہیم کے لئے محرک اول (Prime Mover) کا تصور ضروری ہے۔

ادب کی ان تعریفوں کا موازنہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر نظریۂ ادب کے تحت جو ادب تخلیق پائے گا وہ وقتی اور انقلابی ہوگا۔ دوسرے نظریۂ ادب کے تحت جو ادب فروغ پائے گا وہ زندگی کو بقائے دوام کا پیغام دے گا۔ معروف اخلاقی قدروں کو اجاگر کر کے زندگی کو اس کی کھوئی عصمت دلائے گا اور معاشرہ کی تشکیل کے لئے ایسے اصول دے گا جن سے بہتر اصول ممکن نہیں۔ یہ ادب زندگی کی راہ میں ایک توازن پیدا کرے گا۔ تعمیری ادب جن احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرے گا وہ متوازن ہوں گے اور ان میں بقول افتخار اعظمی "اضطراب زدگی کے بجائے فکر کا ٹھہراؤ، وقار اور تدبر ہوگا۔ اس میں جذبات کی ہنگامہ آرائی نہ ہوگی جس سے اخلاق شر کے محرکات پر قابو پائے گا۔" یہ ادب اخلاقی بنیادوں پر ایک نظام حیات برپا کرنے کی سعی کرے گا۔

شبنم سبحانی

تصورِ خرد و جنوں عقل و عشق

اقبال سے پہلے وسیلۂ شعر و ادب میں ان الفاظ کو کسی جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا، اور ان کا کوئی خاص مقام نہ تھا مگر اقبال نے جو ہستی کو دارِ عشق ماجرے قائل تھے، ان لفظوں میں معنی کا ایک سمندر پنہاں کر دیا اور ان کی شرح جامع تفسیر بیان کی۔ ان کی شاعری بہت کچھ انہیں الفاظ کے محور کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے جگہ جگہ مختلف اندازِ بیان سے عشق و عقل اور خرد و جنوں کی تشریح کی ہے اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے۔ ان کے اس شعر سے ہم ان کی پوری زندگی اور پوری شاعری کا مقصد اور ماحصل سمجھ سکتے ہیں۔

من بندۂ آزادم عشق است، امام من
عشق است امامِ من عقل است غلام من

اقبال نے ہمیشہ عشق ہی کو اپنا امام بنایا اور عقل کو غلام۔ کیوں؟ اس کو مختلف مقامات پر انھوں نے واضح کیا ہے۔ آئیے ہم اس پر نظر ڈالیں۔ لکھتے ہیں۔

ہر دو بمنزلے رواں ہر دو امیرِ کارواں
عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

یہ شعر ان کے مافی الضمیر کو پوری طرح سے عیاں کر دیتا ہے، اور اس میں اقبال نے بہت ہی جچا تلا فیصلہ عقل و عشق کے متعلق دیا ہے۔ منزل دونوں کی ایک ہے۔ راستے جدا جدا، عشق تیز گام ہے اور عقل سست گام۔ عشق اپنے مقصود کی طرف کشاں کشاں چلتا ہے اور عقل ہزار حیلے ہزار بہانے کرتی ہوئی، قدم قدم پر جھجکتی ہوئی سوئے منزل چلتی ہے۔

عشق کی تعریف لامحدود ہے۔ یہ دل کی وہ لگن، وہ جذبہ، وہ اسپرٹ، وہ جستجو، وہ جوش اور وہ شوق ہے جو انسان کے اعضا میں اسے مقصود کے پالینے کی خاطر برقی لہر دوڑا دیتا ہے۔ اسی عشق کی گرمی سے وہ اپنی منزل پالینے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک نامعلوم قوت کارفرما ہو جاتی ہے جو اسے فولاد سے بھی زیادہ مضبوط اور پہاڑ سے بھی زیادہ مستقل مزاج بنا دیتی ہے۔ عقل کسی چیز کو اپنی میزان پر کھرا پاکر پرکھتا اس میں ہر پہلو ترغیب تلاش کرتی ہے اور اس لئے اپنے اندر لگن، جذبہ اور پیاس نہیں پیدا کر سکتی۔ عشق کی ایک

ضربِ کلیم کے سامنے عقل کے سیکڑوں دار بیکار نظر آتے ہیں۔ عقل اندیشہ ہائے دور و دراز میں پھنسی رہتی ہے، عشق ایک لمحہ میں سب کچھ کر گزرتا ہے۔ عقل کتنا جنوں ویرانہ ہے۔ اور یہیں عقل بھی ہے جو زاہد اور سائنس داں بنا دیتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آگے چل کر علامہ نے اس کی وضاحت تفسیر بیان کی ہے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

خرد آنکھ کا نور ہے اور عشق دل کا نور اور قلب کی بینائی ہے۔ عشق کے بغیر انسان ایک تودۂ خاک کے مانند رہ جاتا ہے۔ اسی کی اسپرٹ اس کے رگ و پے میں روح دوڑا دیتی ہے۔ اقبال کے دو اور اشعار درج کرتا ہوں۔

عشق کی تیغِ جگردار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

رہِ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

جب ہم ان الفاظ کی تہ میں اترتے ہیں تو ان میں انسانی زندگی کو کامیاب بنانے والے اہم اجزا کارفرما نظر آتے ہیں۔ انسان کی عملی زندگی کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو صاف صاف نظر آتا ہے کہ محض عقلی دلائل سے مطمئن ہو کر جو فیصلے کئے گئے بہت کھوکھلی بنیادوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ہماری نظر جیسے ہی اس کی قوت سے مگر دل کی میزان پر آنے سے پہلے وہ مال کھوٹا ہی رہے گا۔ جو بات عقل کی منزلوں سے گزر کر دل میں اتر جاتی ہے اس پر ہم تن من دھن قربان کر سکتے ہیں۔ دل مقصود منزل کبھی بھی ہم کو اس مقام پر نہیں پہنچا سکتے ہیں جہاں عشق کی ایک جست سے پہنچ جاتے ہیں جس مقصد سے ہم کو عشق ہو جاتا ہے وہی مقصد ہم پا لیتے

ضم ہو سکتے ہیں۔ عشق ہی وہ ایک قوت لازوال پنہاں ہے جو مادی وسائل
ذرائع کے بالکل منقطع ہو جانے پر بھی ہمارے حوصلوں کو بلند رکھتی ہے۔

یہ انسان کی وہ قوت ہے جو اس کو دنیا میں بڑے بڑے کارنامے کر دکھانے
پر آمادہ کرتی ہے۔ عقل کی بنیاد سراسر مادی قواعد پر رہتی ہے۔ مادی وسائل
کی ناکامی کے مرحلے میں عقل کا ٹٹو بیکار ہو جاتا ہے۔ جس کا ذکر کسی نے کیا ہے۔ ایسا
ہی مقام ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہم اپنی قوتوں سے بڑھ کر۔ جانے کیا کیا کر سکتے ہیں۔
عقل کی عزت خرد کے پیچ و تاب میں الجھ کر ہمارے دماغوں میں رہتی ہے۔ اس کیلئے
سخت مرحلوں میں ہمارے قومی شل بھی ہو سکتے ہیں۔

اقبال نے عشق کو بہت بلند مرتبہ عنایت کیا ہے۔ وہ مغرب کی عقل پرستی کے
نتائج اور کھوکھلے پن سے اچھی طرح واقف تھے۔ مادیت کے سیلاب میں بہتے ہوئے
مغربی تمدن کا انھوں نے اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ انھوں نے وہاں سوز اندروں
اور گرمی عشق کا فقدان دیکھا۔ خرد کی گرم بازاری دیکھی۔ اور اس بازار میں متاع
اخلاق، اخلاص اور محبت کم عیار سمجھی جانے لگی۔ انھوں نے انسانیت کی محمود
عظیم قدروں کو وہاں تباہ و برباد ہوتے دیکھا۔ اپنے نفس اور اپنے شکم کو سب پر
ترجیح دینے والے سماجی جانور بھی دیکھے۔ انسانیت کی معروف اخلاق قدروں
کو اپنے زور بیان اور قوت استدلال کے پیچ و تاب میں الجھا کر ایک مکروہ روپ
میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے دیکھا۔
اور انھوں نے بلند بانگ ہو کر کہہ دیا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

انھوں نے دنیا کو عظمت انسانی سے آگاہ کیا اور عشق کو اس کے تمام شایان
شان انھوں نے دنیا کو آداب جنوں سکھلائے اور مستی کردار کا درس دیا۔ جوش
عمل اور جوہر خودی کی قیمت سے آگاہ کیا۔ انبیاء کرام اور خدا کے دوسرے
برگزیدہ بندوں نے آخر کس جذبے کے تحت اپنے سر آنے والے مقصد عظیم سے
عظیم قربانیاں دیں۔ گرم سلاخوں، نیچی چوٹی نوکیلی صلیبوں، دہکتے ہوئے
انگاروں اور خاردار راہوں سے آخر انھوں نے کیسے تجدید عشق کی۔ ان کے دامن
کی وہ متاع گراں بہا تھی جس نے ان کو اتنا سخت جان اور مستقل مزاج بنا دیا
تھا۔ اور رسالتمآب رسول عربی کی دعوت کو ہزاروں عیسائی، یہودی، کفار و مشرکین

برحق سمجھتے ہوئے دل سے اس کے تقاضوں کے سبب ایمان نہ لا سکے۔ جارج برنارڈ شا
اور دوسرے عمر بھر اسلام کی حقانیت، برتری، عظمت اور بلندی کا اقرار کرتے رہے۔
مگر عمل کی منزلوں پر ان کی ساری گرمی عقیدت سرد پڑ گئی۔

اقبال عشق و جنون کی ان کشمکشوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ انھوں نے سمجھ لیا
تھا کہ عشق کے فقدان سے تحریکیں مٹ جاتی ہیں اور قومیں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ اور
ارادے ٹوٹ جاتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کی مظلومیت کا راز پا لیا تھا۔ اور
عقل زدوں کی لائی ہوئی تباہیوں کو سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے تمام عالم اسلام کا غائر
نظر سے مطالعہ کیا۔ اور ہر جگہ عقل کی کارفرمائی دیکھی۔ زبان سے تو بڑے صداقت حرف
ادا کئے جاتے ہیں اور بڑی لمبی چوڑی وفاداری کی قسمیں کھائی جاتی ہیں مگر عمل کے مرحلے پر
رگوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اس مرض کی بنیاد پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔
بجز عشق اور جنوں کی بھی انھوں نے مخالفت کی۔ اور اس کوری عقلیت کے بھی
دشمن ہوئے جسے مغربی تہذیب نے میکانکیت کا روپ دے دیا تھا۔ وہ مست
صوفیوں اور حال و قال والے خانقاہیوں کے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے عشق کا
کچھ اور مطلب سمجھ لیا — آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ "اقبال جانتے تھے کہ
تخلیقی کاموں اور زندگی کے نازک موقعوں پر بڑے مقاصد کی گرمی، تھوڑی سی
دیوانگی اور جوش و جذبے کی کیا اہمیت ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں عقل و عشق
کا ملاپ ہے۔"

اقبال کے یہ اشعار ہمارے اس خیال کی وضاحت کرتے ہیں۔

عشق اب پیروی عقل خداداد کرے
آبرو کوچہ جاناں میں نہ برباد کرے
کہیں پیکر کو نئی روح میں آباد کرے
یا کہیں روح کو تقلید سے آزاد کرے

اسلام پسندوں نے تصور عقل و عشق اور خرد و جنوں کو اقبال سے پورا پورا
اخذ کیا ہے۔ اور انہی کے مفہوم میں اسے اپنے شعر و ادب میں استعمال کیا ہے۔
حفیظ کا یہ شعر عشق کی اچھی ترجمانی کرتا ہے۔

عشق جب تک رہے رواں ہو — دل بھی ہے بیکار، نظر بھی

ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عقل کے احسانات کو بھی قبول کیا ہے لیکن مجرد عقل
اور عقل پرستی کو غارت گر بتایا ہے۔ حفیظ لکھتے ہیں۔

عقل کے احسانات مسلم — عقل ہے لیکن غارت گر بھی

عشق کی گرمی انھوں کی تمانیت نے انھیں اپنے مقصود کے لئے راہ کے تمام پیچ
و خم اور دشواریوں کا خیر مقدم کرنے پر تیار کر دیا ہے۔ یہ مرد کے علمبرداروں کو

باطل کے خدیعہ پہونچائی گئی تمام مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا درس دیتے ہیں۔ دار و رسن کی منزلوں، خار دار وادیوں، زندان و سلاسل کے دشوار گذار مرحلوں کو طے کرنے کے لئے اسلام پسندوں میں عشق کی حرارت پیدا کرنا چاہتے ہیں ـــــ مغرب کی کورانہ عقلیت کے مخالف ہیں۔

زاہد لکھتے ہیں۔

جنوں تو دار پہ شوقِ طلب میں جا پہونچا
خرد پڑی ہے سرِ رہگذار اک طرف
جنوں پہ اہلِ خرد ہیں حیرت یا اک سمت
نگاہِ رحمتِ پروردگار اک طرف

برق کاکوری کا یہ مصرعہ

جنوں کی رو میں پیچ و خم کوئی کیا راہ کے جانے

اور تسکین قریشی کا یہ شعر

عشق ہے آہ وہ عارتگرِ دل حس کے بغیر
مستی ہوتی نہیں لذتِ احساس نہیں

بھی اسی مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چند اور تعمیر پسند شعراء کے اشعار اسی موضوع پر ملاحظہ کیجئے۔

ساغر ہوشیارپوری ـــــ خیال و فکر کی سیمہ گری سے کیا ہوگا
گذارِ عشق ضروری ہے بندگی کے لئے

آغا صادق ـــــ عشق کا مدعا نہیں۔ رکے
عقل کا مشورہ مقامِ مقام

احمد نسیم ـــــ عشق نے دیکھ لئے دونوں جہاں کے جلوے
اور ابھی اہلِ خرد شمس و قمر تک پہونچے

نشور ـــــ عقل بھی لبد میں سو ٹھوکریں کھا کر پہونچی
عشق گذرا تھا تری راہ گذر سے پہلے

شفیق ـــــ ابھی دیکھی نہیں عظمت ترے دیوانوں کی
فلسفی بھی ترے دیوانوں میں شامل ہو جائے

کوثر ـــــ جنوں پہ ظفر ہو کر جائے ہمیشہ کو ستے ہیں
تو اے تعمیرِ محبت کے راز کیا جانے

انور ـــــ کتنی آساں تھی یہ رسمِ جنوں پہلے
کمی اس دور میں آشفتہ سری مشکل ہے

شبنم ـــــ جسے دولتِ جنوں تو رسائی نہیں وہاں
اے دل مجھے متاعِ خرد پہ غرور رہے

ہمارے کچھ ساتھیوں نے رائج الوقت خرد اور جنون دونوں سے اظہار بیزاری کیا ہے وہ عقل پرستی کے بھی دشمن ہیں اور ہوش و حواس کو غارت کر دینے والے جنوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ ایسا جنوں نہیں چاہتے جو دیوانگی کی حد تک پہونچ جائے۔ وہ ایسی عقل سے نفرت کرتے ہیں جو کائنات کی ہر شئے اور اس کے ہر راز کو اپنی ترازو پر تولنے پر مجبور کرے۔ اکبر مرحوم نے کہا ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

تو اس قسم کی فلسفیانہ کھود کرید اور خیال و فکر کی تیشہ گری ہمارے عظیم مسلک اور مقصد کی بنیاد پر ایک ضرب کاری ہے۔ اسی لئے عاصی ایک ایسے عشق کی تمنا کرتے ہیں جو ان دونوں سرحدوں سے باہر دونوں کے خمیر سے مل کر ایک نئی چیز ہو ـــــ لکھتے ہیں۔

عاصی ـــــ میں وہ عشق چاہتا ہوں جو حدود سے ماورا ہو
نہ جنوں کا آستانہ۔ نہ خرد کی بارگاہیں

حفیظ ـــــ خیال کے دیوتا بھی چھوٹے عمل کے اندھے خدا بھی چھوٹے
خرد بھی دریا درس نہیں ہے جنوں بھی مشکل کشا نہیں ہے

سہیل احمد زیدی ـــــ جنوں کی گمرہی کو راہِ جاناں کون کہتا ہے
خرد کی قید کو حیف جگر ساں کون کہتا ہے

شاکر ـــــ سرِ آہستہ کی تکمیل کوئی تصور نہیں
مستی سنجیدہ نہیں عقل جنوں گر نہیں

اسلام پسند ادیب اور شاعر کبھی مجرد جنوں یا مجرد خرد کی تلقین نہیں کر سکتا۔ وہ دونوں کا ایک حسین امتزاج ضروری سمجھتا ہے۔ اور اس کے بغیر دونوں بیکار ہیں۔ انور صدیقی کا یہ شعر میرے اس بیان کی صداقت عیاں کرتا ہے۔ اور کامیاب شعر ہے۔

میرے جنوں میں جلوۂ نورِ خرد بھی ہے ندیم
عشق تو بے دریغ نہیں جسو رہا ہے بے خبر تو کیا

ترقی پسندوں نے بھی ان الفاظ کو اقبال ہی کے تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اپنایا ہے ـــــ پھر بھی ان کے خیال و فکر میں یک رنگی نہیں ہے۔ ان کے تصورِ خرد و جنوں میں بڑا اختلاف ہے ـــــ کچھ لوگ مغرب کی عقل پرستی سے اتنا زیادہ متاثر ہوگئے ہیں کہ ان کی نظر میں جنوں کی کچھ وقعت ؟

نہیں رہ گئی ہے۔ جس کی ترجمانی اطہر سعید کا یہ شعر کرتا ہے۔

خرد نے خفتہ حقائق کو کر دیا بیدار
جنوں کی خواب فروشانہ کوششوں سے کہو

اور کچھ حضرات عشق و جنوں کی بلندی و عظمت کا بڑے اچھے انداز میں اعتراف کرتے ہیں ——— ان کے اُن اشعار کو ہم سراہے بغیر نہیں رہ سکتے جن میں جنوں کی قیمت کو مانتے ہوئے خرد کی اہمیت جتائی گئی ہے۔

یہاں جنون و خرد کا عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ اور ہم اس درمیانی راستے کو پسند کرتے ہیں۔ اکبر حیدری کا یہ شعر اس معنی میں کامیاب شعر ہے۔

جمالِ زیست تصویرِ جنونِ دل سہی لیکن
جمالِ زیست میں شامل خرد کا بانکپن بھی ہے

خرد اور جنوں آج یہ دونوں الفاظ موجودہ شاعری کے اہم محور بن گئے ہیں اقبال نے کوری عقلیت اور عشق کا تقابلی مطالعہ کیا اور سب سے پہلے انہیں کی شاعری سے یہ صحت مند تعمیری سوتے پھوٹے اور ہم تک آتے آتے تغزل کی جان بن گئے ——— یہ بہت ہی معنی خیز الفاظ ہیں۔ ان کے قالب کے پیچھے ایک وسیع مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے۔ آج یہ ہر چھوٹے بڑے کی زباں پر ہیں۔ ہر کوئی ان کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ مگر ابھی تک زیادہ تر عشق و جنوں کو سراہا گیا ہے۔ اور عقل سے لوگ متنفر رہے ہیں۔ عقل بھی بہر حال اللہ کی دی ہوئی ایک قابل قدر قوت ہے۔ اس کو ہم اس طرح ذلیل بھی نہیں سمجھ سکتے۔

ہم نے عقل سے جو فیض حاصل کیا ہے اس کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس کے فائدوں سے آنکھیں بند کر کے ہم ایک غیر معمولی قوت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے ہمیں جس عقل سے اختلاف ہے وہ ہے خرد کا غلط استعمال جو خرد جو زندگی کے ہر موڑ پر ہمیں مصلحت برتنے میں اُٹھا کر ہماری راہ کا روڑا بنتی ہے۔ ہمارے لئے یہ پہلو بہت کم تر نہیں ہے۔ مغرب نے اس سیاہ پہلو کو جو عقل کے بُرے استعمال سے پیدا ہوا ہے ہم کاٹ پھینکیں گے اور اس کے تعمیری پہلو کو اپنائیں گے ساتھ ہی ساتھ ہمیں عشق کی بھی اصلاح کرنی ہے۔ عشق کو بھی کامل صحت مند بنانا ہے۔ ہمارے شعراء خوش ہیں کہ ان الفاظ کے ساتھ بہک نہیں رہے ہیں اور بڑے شعور کے ساتھ عقل و عشق کی تفسیر و تشریح اپنے اشعار میں بیان کر رہے ہیں۔ تعمیر پسندوں کے چند اشعار پیش کرتے ہیں قارئین [illegible] ہوں گے۔

برق ——— خرد کی آنچ نے پگھلا دئیے احساس کے سانچے
مئے عرفاں سے خالی ہو چکے ہیں دل کے پیمانے

عنوان ——— خرد معدوم کر دیتی کاش کچھ سے کچھ یہ وحشت
ثبوتِ آشنائی پر گریباں کون دیکھے گا

جلیل ——— عقل رہزن بھی تھی رہِ عشق میں
بڑھ کے جوشِ جنوں پاسباں بن گیا

حفیظ ——— کوئی ہوش سے گزر گیا، کوئی جوش سے گزر گیا
وہ جنوں کی حیلہ سازی یہ خرد کی حیلہ سازی

حقی حزیں۔ ایم۔ اے

O

کس سے کہیے حالِ شبِ غم
کون ہے اے دل اپنا محرم

ان سے کوئی اب ربط نہیں ہے
ہائے وہ ان کا وعدۂ محکم

شرحِ محبت توبہ توبہ
جتنی واضح اتنی ہی مبہم

ہاں اسے پھر آواز سنا دو
دل کی صدا پھر ہوگئی مدھم

چاندنی راتیں ان کا تصور
ہو بہو جیسے خواب کا عالم

اس کے سوا کیا دل کی ہستی
سوزِ مکمل، دردِ مجسم

کوئی نہ ہو جب سننے والا
دل کا دھڑکنا دل کا ماتم

یاد ہے اب تک وقتِ رخصت
آہ حزیں وہ چشمِ پُرنم

حفیظ میرٹھی

O

سوز نہ ہو تو سازِ حیات
صرف اِک روکھی پھیکی بات

جل اٹھ جل اٹھ شمعِ یقیں
رات ہے اور اندھیری رات

آہ یہ حسن کی نایابی
اُف یہ جلوؤں کی بہتات

اُن کا کھیل دل آزاری
اور مرے نازک جذبات

جان ہتھیلی پر رکھ لے
کہنی ہے گر سچی بات

معصوموں پر آئے ہیں
کیسے کیسے الزامات

کوئی ہنسے کوئی روئے
یہ اپنے اپنے حالات

نامحکم بنیادِ ہوس
عشق سراپا صبر و ثبات

کیفؔ نوگانوی

○

کوئی مونس کوئی غمخوار نہیں ہے نہ سہی
اب کہیں سایۂ دیوار نہیں ہے نہ سہی

صاحبِ دل ہی کوئی دار کو زینت بخشے
صاحبِ عقل سرِ دار نہیں ہے نہ سہی

حسنِ کردار تو ہے باعثِ تسخیرِ جہاں
تیرے قبضے میں جو تلوار نہیں ہے نہ سہی

تم جو چاہو سرِ ساحل ہی ڈبو دو کشتی
میری قسمت میں جو منجدھار نہیں ہے نہ سہی

آپ تو عقلِ جہاں سوز پہ قابو کیجے
میرے قابو میں دلِ زار نہیں ہے نہ سہی

کیفؔ اپنا تو گریبان رفو کر لیجے
میرے دامن میں کوئی تار نہیں ہے نہ سہی

احقرؔ کانھی پوری

○

وہ تخیّل جو رہِ حق پہ رواں ہوتا ہے
جامِ زہراب ہی پی پی کے جواں ہوتا ہے

غم تری روح میں یوں رچ سا گیا ہے مطرب
تیرے گیتوں پہ بھی آہوں کا گماں ہوتا ہے

یاس انگیزیٔ ماحول الٰہی توبہ
ذکرِ گلشن بھی بہ تمہیدِ خزاں ہوتا ہے

دل سے سرگوشیاں کرتی ہیں جب اُن کی یادیں
ایک پُرکیف و سکوں خیز سماں ہوتا ہے

غم کے جانے پہ بھی رہتی ہیں خراشیں باقی
ختم کب سلسلۂ آہ و فغاں ہوتا ہے

کیوں سناتا ہے مجھے گیت کہ یہ دنیا ہے
ہر نفس عمر کا یاں مرثیہ خواں ہوتا ہے

سہیل احمد زیدی

○
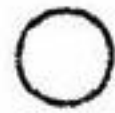
جہلِ خرد کیا جانے کیوں
خاک ہوئے پروانے کیوں
شیشۂ دل جب چور ہوا
یاد آئے تم جانے کیوں
کس سے ہو ایمانِ وفا
اپنے ہوئے بیگانے کیوں
کون حقیقت راز میں ہے
پھیلے ہیں افسانے کیوں
ان کی نظر کیا کم ہے ہمیں
ہم جائیں میخانے کیوں
کس کو غرض تم سے ہے سہیل
کوئی تمھیں پہچانے کیوں

عنوانِ چشتی ۔ منگلوری

○

سرنگوں ہو گیا تیرگی کا علم
مرحبا مرحبا اے چراغِ حرم
چونک اٹھوں کیوں نہ احباب کے نام پر
میں نے کھایا ہے اکثر فریبِ کرم
مصلحت ہے یہ آہستہ گامی نہیں
ورنہ آگے رہا ہے ہمارا قدم
بے خرد دشمنوں کو بتا دے کوئی
مٹنے والے نہیں ہیں زمانہ سے ہم
مسکرا کر پیامِ محبت نہ دے
میں نے اپنا لیا ہے زمانہ کا غم
غم نے عنوان اگرچہ سہارا دیا
لڑکھڑا ہی گئے زندگی کے قدم

محمد تاج الدین تاج اورنگ آبادی

O

تابانیِ فضائے زمان و مکاں بھی دیکھ
گلشن بھی دیکھ قلب کا اپنے جہاں بھی دیکھ

غم دیدۂ بہار کا حسنِ بیاں بھی سن
اے بے خبر حقیقتِ آہ و فغاں بھی دیکھ

اے عیش کوش دامنِ عصمت کی لاج رکھ
تھرا رہا ہے عرشِ بریں آسماں بھی دیکھ

سمجھا ہوا ہے جس کو تو فانوسِ زندگی
تعبیرِ حق کی صورتِ خوابِ گراں بھی دیکھ

آئینۂ ازل میں ابد جلوہ بار ہے
فکر و نظر کا حاصلِ طرزِ بیاں بھی دیکھ

آثار ہیں تمام یہ عزم و ثبات کے
کیفِ عمل کا اپنے یقین و گماں بھی دیکھ

اے تاج زندگی کے ساتر ہیں بے نہاں
باقی ابھی ہیں فکر و نظر کے جہاں بھی دیکھ

مضطر جبل آبادی

O

جہانِ آرزو میں سعیِ قطعِ آرزو کب تک؟
اسیرِ پنجۂ غم ہو! خوشی کی جستجو کب تک

غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ ہستی، غمِ دنیا!
کوئی پیتا رہے شام و سحر دل کا لہو کب تک!

یہ ہے بازی محبت کی نہیں بازی یہ طفلانہ
یہ ہر اک گام پر تجھ کو بہک جانے کی خو کب تک

حجابِ زندگانی کس لئے اٹھتا نہیں یارب!
یونہی کھاتا رہے کوئی فریبِ آرزو کب تک

یہ مانا ہیں بہت ہی دلنشیں محفل کے ہنگامے
مگر محفل میں یوں بیٹھے گا اے ناداں تو کب تک

کر اپنے پیکرِ خاکی میں کچھ سوزِ یقیں پیدا
کہ یہ بیگانگی از آئینہ لا تقنطو کب تک

تری وحشت کی غیرت کو ہوا آخر یہ کیا مضطر
رہے گا تیرے دامن پر یہ احسانِ رفو کب تک

تنگ کمرہ

مصنف :۔۔۔ آرتھر میچن
مترجم :۔۔۔ ابنِ فرید

(۱)

اور اُس نے خود کو انتہائی استعجاب میں پایا کہ وہ مقررہ جگہ پر ایک نمایاں اطمینان کے ساتھ پہونچ گیا ہے۔ یہ سچ تھا کہ دریچہ دیوار میں کسی قدر بلندی پر تھا۔ اور آتش زدگی کے حادثہ پاس سے کسی طرح نکلنا ممکن نہ تھا کیونکہ لندن کے تہہ خانوں کے روشندانوں کی طرح اس میں سلاخیں جڑ دی گئی تھیں لیکن دوسری حیثیتوں سے وہ انتہائی تنگ کمرہ تھا۔ اُس کی دیواروں پر خوشنما پھولدار کاغذ چسپاں تھا۔ ایک کتاب گیر ۔ اگر وہ گرانی محسوس کرے ۔۔۔ دریچہ کے نیچے ایک چھوٹی سی میز ایک تختہ اور مسہری کے ساتھ دو تین خوبصورت تصاویر مذہبی اور عام نوعیت کی، اور وہ آدمی جو اس کا نگراں تھا، کمرہ کی وسطی میز پر چائے وغیرہ سجا رہا تھا۔ اور روشن آگ کے سامنے بید کی کرسی پڑی ہوئی تھی۔ بہر حال وہ مکمل طور پر ایک خوشگوار کمرہ تھا حالانکہ اب اُسے کوٹھری ہی کہیں گے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ سب کچھ کسی نہ کسی طرح ختم ہو چکا تھا۔

(۲)

اسے ایک گھنٹہ پہلے تین ماہ تک بڑا حیرت انگیز زمانہ گذرا تھا۔ سب سے پہلے وہ مصیبت شروع ہوئی اور ایک منٹ میں ختم ہو گئی۔ اور یہ سب ایک لڑکی کے واسطے ہوا جو اس کی مستحق بھی نہ تھی۔ لیکن اب اس کو کسی طرح قصبہ سے نکل بھاگنا تھا اُس نے پہلے سوچا کہ وہ اپنے معمول پر لگ جائے اور اس حادثہ کے بارے میں بالکل انجان بن جائے۔ وہ کیسے سمجھ سکتا تھا کہ کسی نے اُس کو ندی کے ساحل تک خوف کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیوں نہ وہ ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کرتا پھرے۔ اور اس کا نام ہی نہ لے۔ اور رنگ لینڈ آرمس میں اچھی بوتل سے لطف اندوز ہو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے لاش کو جھاڑیوں کے پیچھے عرصہ ہوا تلاش کر لیا ہو اور اُس کے بارے میں تلاش و جستجو ہو رہی ہو۔ یہ بھی بہترین تدبیر ہو سکتی ہے کہ وہ باہر نکل آئے اور اگر پولیس اُس سے تفتیش کرے تو وہ اپنی زبان کو جنبش ہی نہ دے لیکن پھر بھی وہ اس شام کی اپنی مصروفیات کے بارے میں کیا بیان دے گا؟ وہ کہہ سکتا ہے ملیٹن کے کھنڈرات تک چہل قدمی کرنے گیا تھا اور راستے میں کسی سے ملاقات کئے بغیر پھر واپس آ گیا۔ وہ جو کچھ سوچ رہا تھا اُس کی کوئی تردید کرنے والا ہی نہ تھا۔

اور اب خوش وضع کاغذ دار دیواروں کے تنگ کمرے میں تنگ کرسی پر آگ کے سامنے بیٹھا ہوا ۔۔۔ کتنی متضاد روایات لوگ ان چیزوں کے بارے میں بیان کرتے تھے ۔۔۔ وہ تو بحث کر رہا تھا کہ کاش انہوں نے خود کو پیش کر دیا ہوتا۔ اور اس کو جھیل لیا ہوتا اور ان کو زنے دیا ہوتا اور وہ جو کچھ تلاش کر سکتے تلاش کر لیے دیا ہوتا لیکن پھر وہ خوف زدہ ہو گیا متعدد آدمیوں نے اُسے حلفیہ بیان کرتے ہوئے سنا تھا کہ یہ تفریح کے واسطے چہل قدمی ہی ہوتی اگر وہ اُس لڑکی کو اکیلا نہ چھوڑ جاتا۔ اور اس نے اپنی ریوالور، ڈک ہیڈن، لوسیٹا کیری اور فنی میں اور دوسروں کو دکھایا ہوتا اور انھوں نے ریوالوروں میں گولیاں بھری ہوتیں اور قصہ ختم ہو جاتا۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ اور ہیبت سے کانپ گیا۔ اور اُس کو یقین ہو گیا کہ وہ اب لیڈھم میں کبھی سکونت اختیار نہیں کر سکتا ایک گھنٹہ بھی نہیں۔

(۳)

مسٹر ریواش۔ اُس کی مالکہ مکان اپنی شادی شدہ لڑکی کے ساتھ قصبہ کے دوسرے حصہ میں شام گذار رہی تھی۔ اور گیارہ بجے رات سے قبل آنے والی نہ تھی۔ اُس نے اپنی گھنی داڑھی اور مونچھوں کو مونڈ ڈالا۔ اور اندھیرے میں قصبہ سے چھپتا چھپاتا نکل گیا۔ اور صبح ہی بیس میل دور دوراہی پہونچ گیا تاکہ لندن کے سفر کے لئے بروقت گاڑی پکڑ سکے۔ اس وقت بے انتہا بھیڑ تھی اور جہاں تک وہ دیکھ سکتا تھا اس کا اپنی جان پہچان کا کوئی بھی نہ آتا تھا اور ڈبے وارڈن اور آکس ووڈ کے کپڑے والوں سے بھرے ہوئے تھے جو اپنے آپ میں مگن تھے اور اُس کی طرف توجہ ہی نہیں کر رہے تھے۔ وہ سب کے سب کنگس کراس پر اتر گئے۔ اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ چلنے لگا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسا کہ وہ کمرہ بند تھے اور سب کے ساتھ ایک

گلاس جو کی شراب سے بھرا ہجوم شراب خانہ سے پی۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا
کہ کیسے کوئی پتہ لگا سکے گا کہ وہ کہاں گیا ہے۔

(۴)

اس نے کلروسیہ کی سڑک کی ایک خاموش گلی میں ایک سستا کمرہ حاصل
کر لیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اس رات شام کے اخبار میں کوئی خاص بات تھی جس سے
آپ کوئی صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکتے تھے۔ دوسرے دن جون کی لاش مل گئی۔
اور انہوں نے تحقیق کر لی کہ وہ قتل تھا ۔۔۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ خودکشی
ہو ہی نہیں سکتی۔ اور پھر اس کا نام منظر عام پر آ گیا۔ وہ لاپتہ تھا اور اس سے
تقاضہ کیا گیا تھا کہ وہ خود کو پیش کر دے اور یہ قیاس کیا جا رہا تھا کہ وہ لندن
چھوڑ چکا ہے۔ اور وہ خوف سے نیم جان ہو گیا۔ اس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا
اور ایک جاتا تھا۔ کوئی چیز اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔
وہ اپنے کمرہ کو واپس جانے سے بھی خوف کھا رہا تھا کیونکہ اسے گمان ہو رہا تھا وہ اب
اس میں قیام نہیں کر سکتا۔ وہ برابر فرش کی ایک تختی کی طرح روندتا رہے گا۔
اور اس کی مالکہ مکان حیرت میں گرفتار ہو جائے گی۔ وہ گلی پر پھرنے سے بھی خوفزدہ
تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کوئی پولیس کا سپاہی اس کے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر
ہاتھ رکھ دے گا۔ وہاں ایک گوشہ میں ایک مربع تھا۔ وہ اس کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔
اور اپنے چہرے کے سامنے اخبار کر لیا۔ بچے اس کے گرد شور مچاتے اور چیختے ہوئے
دوڑتے بھاگتے رہے۔ انہوں نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ اور اس کے باوجود
وہ اس کی معیت میں رہا تھے۔ یہ کمرے کی تنہائی سے کتنا مختلف ماحول تھا۔ لیکن جلد
بخارات بھیگنے لگی اور ملازم پھاٹک بند کرنے آ گیا۔

(۵)

اور اس رات کے بعد متعدد راتیں اور متعدد دن خوف اور ہیبت کے
اس طرح گزرے کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ان کو جھیلے گا اور زندہ بھی
رہے گا۔ وہ اپنے ساتھ کافی پیسے لایا تھا کہ کچھ عرصہ با فراغت گذر سکے لیکن جب
بھی وہ کوئی نوٹ ریزگاری میں تبدیل کراتا تھا تو خوف سے کانپ جاتا تھا کہ
کہیں اس کا پتہ نہ لگ جائے۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ کہاں جا سکتا تھا؟ کیا وہ
ملک سے باہر جا سکتا تھا؟ لیکن اس کے لئے پاسپورٹ اور مختلف طرح کے
کاغذات کا جھنجھٹ تھا۔ اور یہ وہ کبھی بھی نہ کرے گا۔ اس نے اخبار میں دیکھا
کہ پولیس کو ہیڈہم کے قتل کے راز کا کچھ سراغ لگ گیا ہے اور وہ بڑبڑاتا ہوا
اپنی جائے سکونت کو پہونچا اور خود کو مقفل کر لیا اور شدت غم اور اذیت سے
کراہنے لگا۔ اور پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ بے ربط جملوں میں بغیر کسی معنی و مطلب کے
بڑبڑا رہا ہے۔ گھگیا رہا ہے۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ . . .
. . . یہاں، یہاں، یہاں، یہاں . وہاں، وہاں، وہاں . . . . . .
اچھا، اچھا، اچھا . . . . محض اس وجہ سے کہ اسے کچھ کہتے رہنا چاہئے۔
کیونکہ وہ اذیت اس کے دل میں شگاف پیدا کئے دے رہی تھی۔ وہ بے بنیاد
خوف اس کی جان خشک کئے دے رہا تھا۔ ہیبت کا بوجھ اس کے سینے کو
کچلے دے رہا تھا لیکن پھر کچھ بھی نہ ہوا۔ اور ایک موہوم سی، دھندلی، جھلملاتی
ہوئی امید اس کے دل میں چند لمحوں کے لئے ابھرنے لگی۔ اور دو ایک دنوں
تک وہ محسوس کرتا رہا کہ شاید اسے کوئی نجات کی صورت میسر آ جائے۔

ایک رات وہ ایسی شگفتہ حالت میں تھا کہ وہ کونے پر کے مختصر
پبلک ہاؤس چلا گیا۔ اور معمولی سی خوشی کے ساتھ ایک بوتل ہلکی نشہ آور بھوری
شراب پی، اور سوچنے لگا کہ اب آئندہ کیسی زندگی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اگر
کسی معجزہ کے ذریعہ ۔۔۔ اس نے اس کیفیت کے باوجود محسوس کیا کہ وہ ایک
معجزہ ہی ہوگا ۔۔۔ یہ سارا خوف و خطر فنا ہو جائے اور وہ ایک بار پھر
دوسرے انسانوں جیسا ہو جائے، اور کسی چیز کا بھی ڈر نہ رہ جائے۔ وہ بھوری
ہلکی شراب سے لطف لے رہا تھا۔ اور ایک خیالی دنیا تعمیر کر رہا تھا کہ بار
کی طرف سے اتفاقیہ بلند ہونے والے جملے نے اس کو چونکا دیا۔ "وہ اس کے تعاقب
میں یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں"۔ اس نے شراب کے
گلاس کو نصف بھرا ہوا چھوڑ دیا اور اس خواہش میں باہر نکل گیا کہ شاید اس میں
اتنی ہمت ہو کہ وہ اس رات اپنا خاتمہ کر لے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بار میں لوگ
ایک نئے اور ہتھیر کبھی نہ پکڑے جانے والے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن
ایسے تمام فقرے اس کی بدنصیبی کے لئے خوفناک روح تھے۔ اب آئندہ اور ہمیشہ
وہ اپنے آپ کو خوف کے مقابلہ میں روکے گا۔ وہ ٹرٹرانے اور گھگیانے پر قابو
حاصل کرے گا۔ اور حیرت کے ساتھ دیکھا کرے گا کہ انسان کا دل اس قدر تلخ
یاس اور شدید اذیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ جیسے اس نے یہ تحقیق کر لیا تھا کہ
تنہا وہی تمام انسانوں سے مختلف ایسی دنیا میں رہ رہا ہے جس کو کسی نے خواب
میں بھی نہ دیکھا ہوگا اور اگر کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کیا جائے جس پر کوئی یقین
بھی نہ کرے گا۔ وہ اپنی گذشتہ زندگی میں ایسے چند ایک ڈراؤنے خوابوں میں جاگا
جن میں انسان اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اتنے خوفناک تھے۔ اتنے خوفناک کہ
ان میں سے دو تین نے اسے برسوں مضطرب رکھا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے
میں جو وہ اب جھیل رہا ہے۔ وہ محض راحت تھے۔ وہ اسے جھیل نہیں رہا تھا۔
بلکہ جلتی ہوئی آگ میں اینٹھتے ہوئے کرمان کی طرح ان سے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔

وہ گلیوں میں باہر نکل گیا۔ جن میں سے کچھ پُرسکون تھیں اور کچھ پُرشور
اور وہ ہیبت زدہ ذہنی انتشار میں فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ کس کا

انتخاب کرے۔ وہ اس کی تلاش لندن کے اس گوشہ میں بھی کر رہے تھے، وہاں
ہر قدم پر موت کی دہشتناکی کا خطرہ تھا۔ شاید وہ گلیاں محفوظ ہوں جن پر
لوگ قہقہے لگاتے ہوئے اور خوش گپی کرتے ہوئے گذر رہے تھے، وہ ان کے
ساتھ چہل قدمی کر سکتا ہے اور ان میں سے ایک معلوم ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح
ان کی توجہ سے کافی حد تک بچ سکتا ہے جو اس کا تعاقب کر رہے ہیں ——
لیکن اس لمحہ طاقتور برقی قمقموں نے ان گلیوں کو تقریباً دن کی طرح روشن
کر دیا۔ اور راہ گیروں کا ایک ایک نقش نمایاں نظر آنے لگا۔ ٹھیک ہے کہ اس
کی داڑھی مونچھیں صفاچٹ ہیں، اور اخباروں میں اس کی تصویریں اسے
باریش ظاہر کرتی ہیں۔ اور اس کا چہرہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی
ایسی آنکھیں بھی ہیں جو ان بہروپوں کے اندر تک جھانک سکتی ہیں۔ اور ہو سکتا
ہے وہ لیڈہم سے کسی ایسے شخص کو لے آئے ہوں جو اس کو اچھی طرح پہچانتا ہو۔
اس کے چلنے کے انداز کو جانتا ہو۔ اور اس طرح اسے کسی بھی لمحے للکارا جا سکتا ہے
اور روکا جا سکتا ہے۔ وہ ہمت ہی نہ کر سکا کہ منور برقی قمقموں کے نیچے چل سکے۔
وہ خاموش اور اندھیری گلیوں میں ہی محفوظ رہے گا۔

وہ ایک نزدیکی خاموش گلی کا رخ کرنے کے لئے مڑنے ہی والا تھا کہ
وہ جھجکا۔ یہ گلی بیشک کافی تاریک تھی۔ اور اس پر اچھی طرح روشنی بھی نہیں تھی۔
یہ بھوری اور نیچی دو منزلہ عمارتوں والی گلی تھی جس کے ہر مکان میں تین چار خاندان
گذر بسر کر رہے تھے۔ تھکے ہوئے انسان دن بھر کی محنت کے بعد یہاں گھروں کو
آ رہے تھے۔ انہوں نے قبل از وقت ہی پردے گرا دیئے تھے۔ اور جلد ہی بستروں
پر چلے گئے تھے۔ اس گلی میں قدموں کے نشان شاذ و نادر تھے۔ ان گلیوں میں
بھی جن سے یہ ملتی تھی۔ اور برقی قمقمے بہت تھوڑے، اور مصروف شاہراہوں کے مقابلے
میں کم اور دھندلے تھے۔ اور اس کے باوجود کہ اس وقت چند ایک انسان ہی
گذر رہے تھے۔ وہ کچھ اور توجہ کا مرکز بن گیا اور مشتبہ ہو گیا۔ پولیس کے سپاہی
آہستگی کے ساتھ رکھوالی کے لئے تاریک گلیوں سے اسی طرح گذر رہے تھے
جیسے وہ روشن گلیوں سے گذرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں انہیں
تھوڑے آدمیوں پر ہی نظر رکھنی ہوتی ہے، اس لئے وہ گلی کے کتے۔ وہاں پر گذرنے
والوں کو غور سے دیکھتے ہیں۔ اس کی دنیا میں اس جان لیوا ویرانے میں جس کی
تلاش اس نے تنہا کی تھی۔ اور جس میں وہ تنہا رہ رہا تھا اندھیرا دن سے زیادہ
روشن تھا۔ اور خلوت زیادہ خطرناک تھی جلوت سے۔ وہ روشنی میں جانے کی
ہمت نہ کر سکا۔ اور سایوں سے خوف کھانے لگا۔ اور لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرہ کو چلا گیا۔
اور کانپتا رہا۔ جیسے جیسے رات گذرتی رہی۔ کانپتا رہا اور خود ہی اپنی فکر وہ مالا
جپتا رہا۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ....

عظیم الشان، عظیم الشان ..... یہی طریقہ ہے، یہی طریقہ ہے، یہی طریقہ
ہے یہی طریقہ ہے ..... ہاں، ہاں، ہاں، ..... اعلیٰ درجہ کی۔
اعلیٰ درجہ کی ... بہت اچھا ... ایک، ایک، ایک، ایک سے
دھیمی آواز میں گنگناتا رہا تاکہ خود کو وحشی درندے کی طرح چلانے سے باز رکھ سکے۔

(۶)

وہ ایک وحشی درندے کی طرح اپنی قسمت کے پنجرے سے خود کو ٹکرا رہا تھا
اور جھنجھوڑ رہا تھا۔ اور وہ اسے بار بار اس طرح چوٹ پہنچا رہی تھی جیسے وہ غیر
معتبر ہو۔ وہ یقین نہیں کرتا تھا کہ یہ ایسا تھا، یہ کچھ اس طرح تھا کہ جیسے وہ جا
پڑا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے وہ خوفناک خوابوں سے جاگا تھا جو اس کو یاد ہیں۔
کیونکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوا کرتا وہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقین نہیں
کرتا تھا۔ یا یہ اگر اس طرح ہوا تو یہ تمام مصائب کسی اور شخص پر گذر رہے تھے۔
جس کی بدبختی میں وہ پراسرار طور پر داخل ہو گیا تھا۔ یا پھر وہ ایک کتاب
میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک کہانی میں تبدیل ہو گیا تھا جس کو پڑھ کر انسان
لرز جاتا ہے۔ لیکن اس سے ایک لمحہ کے لئے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔
محض ظن و قیاس، یقیناً۔ شاید پھر سب کچھ درست ہو جائے۔ اور تب
حقیقت اس کے دہکتے ہوئے غم کے انگاروں پر ہتھوڑے کی چوٹ کی طرح آ پڑتا۔

وہ بار بار خود سے استدلال کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو معقول بننے پر
مجبور کر رہا تھا جیسا کہ وہ چاہتا تھا اور اتفاقات کو رد دینا نہیں چاہتا
تھا۔ بہرحال، یقین رکھتے ہوئے جب وہ ڈرائنگ کی مسافر گاڑی میں سوار ہوا۔
اور وہ اس وقت آزاد تھا۔ اور پھر آزادی کا دن اس کے لئے اتفاقات کی
خوشکن نوید تھا۔ ایسی واردات اکثر امتداد زمانہ کی نذر ہو جاتی ہیں۔
ایسے متعدد واقعات ہیں کہ پولیس اس شخص کو پکڑ بھی نہ سکی جس کے پیچھے
لگی تھی۔ اس نے اپنا پائپ جلایا اور معاملات پر خاموشی سے غور کرنے لگا یہ
ایک بہترین تدبیر ہو گی کہ وہ مالکہ مکان کو نوٹس دیدے اور ہفتہ کے اختتام
پر مکان چھوڑ دے۔ اور جنوبی لندن میں کہیں سکونت اختیار کرے۔ اور کسی
طرح کا کوئی پیشہ اختیار کرے، یہ ان کو اس کے تعاقب سے دور ہٹا دے گا۔
وہ کھڑا ہو گیا۔ اور دریچے سے باہر کچھ سوچتے ہوئے دیکھا اور اپنا سانس
روک لی۔ سامنے اخبارات کی چھوٹی سی دوکان پر شام کے تازہ اخبار کا
اشتہار آویزاں تھا۔ لیڈہم کے قتل کے راز کا پتہ نہ

ــــ

آخری لمحہ آگیا۔ اس کو وہ اصل طریقہ معلوم ہی نہ ہو سکا جس سے پولیس اس
کو گرفتار کر لیا گیا۔ درحقیقت، ایک عورت جو اس کو اچھی طرح جانتی تھی۔

(باقی صفحہ ۶۸ پر)

مصنف:۔۔۔۔ جان بنیان۔ (John Bunyan)
مترجم:۔۔۔۔ جادہ پیما۔

مُسافر

{ John Bunyan کی مشہور تصنیف
Pilgrim's Progress کا ترجمہ اسلامی انداز کے پیرایہ میں۔ }

آبادی سے دور ایک دن چلتے چلتے میں ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں ایک غار تھا۔ اور وہاں لیٹ گیا۔ لیٹ کر نیند آگئی۔ اور جب میں سویا ہوا تھا تو میں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب میں مجھے بوسیدہ سے کپڑے پہنے ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ منہ اس کا اپنے گھر کی طرف تھا۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اور پشت پر بڑا بھاری بوجھ تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ کتاب کھول رہا تھا۔ پھر اس میں سے کچھ پڑھنے لگا۔ اور جیسے جیسے پڑھتا جاتا روتا جاتا اور کانپتا جاتا اور جب اس کی بھی تاب نہ رہی تو ایک دلدوز چیخ کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور زبان سے یہ الفاظ نکلنے لگے "ہائے اب کیا کروں"

اس حالت میں آخر وہ گھر گیا۔ اور ایک گوشے میں بیٹھ رہا۔ تاکہ بیوی اور بچوں کو اس کی مصیبت کا پتہ نہ لگ سکے۔ لیکن زیادہ دیر تک اس سے چپ رہا گیا اس لئے کہ اس کی مصیبت بڑھ گئی تھی۔ بالآخر اس نے اپنی ذہنی کیفیت کا سب حال بیوی بچوں پر کھول دیا۔ اور ان سے اس طرح کہنے لگا۔

"بیوی اور بچو! میں اس وقت ایک بھاری بوجھ کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ ہمارا شہر آسمانی آگ میں جلا دیا جائے گا۔ اور اس بھیانک آگ سے میں اور بیوی بچے سب تباہی کی زد میں آجائیں گے بچنے کی صورت ایک یہی ہے کہ بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ مل جائے اور وہ نظر نہیں آتا۔ اس کے متعلقین بہت متعجب ہوئے۔ یہ نہیں کہ انہیں ان باتوں کا یقین آگیا تھا بلکہ انہیں خیال ہوا کہ اس کا ذہنی توازن متاثر ہو رہا ہے اس لئے ہدایت نزدیک آ ہی رہی تھی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ نیند سے اس کے دماغ کو سکون مل جائے۔ جلد ہی اس کو لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ مگر رات بھی اس کے لئے اتنی ہی تکلیف دہ رہی جتنا تکلیف دہ دن گذرا تھا۔ بجائے سونے کے اس نے رات آنسو بہانے اور آہیں بھرنے میں کاٹ دی۔ پھر جب صبح ہوئی تو ان لوگوں کو اس کی خیر خبر لینے کا خیال آیا۔ اس نے بتایا۔ حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ اس نے پھر ان لوگوں سے بات چیت کرنی چاہی۔ مگر انہوں نے سختی سے کام لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے سوچا کہ اس کے سر کا سودا سختی سے پیش آنے ہی سے مٹ سکتا ہے۔ کبھی وہ پھبتی کستے۔ کبھی برا بھلا کہتے۔ اور کبھی اس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے۔

لہٰذا وہ خود کو زیادہ تر کمرے میں رکھنے لگا۔ وہاں بیٹھا ان لوگوں کے حق میں دعا کرتا اور ان کی حالت پر ترس کھاتا۔ اور اپنا غم بھی غلط کرنے کی کوشش کرتا میدان میں تنہا ٹہلنے کو بھی نکل جاتا۔ کبھی کچھ پڑھتا ہوا کبھی خدا کے حضور میں دست بدعا۔ اور اس طرح چند دن تک وہ اپنا وقت گذارتا رہا۔

اب ایک وقت کے بعد میں نے دیکھا، جب وہ میدان میں ٹہل رہا تھا تو حسب معمول اپنی کتاب میں سے کچھ پڑھ رہا تھا اور بڑی ذہنی الجھن میں مبتلا تھا۔ اور جوں جوں پڑھتا جاتا پھوٹ پھوٹ کر روتا جاتا۔ اور پہلے کی طرح چلاتا جاتا "میں بچنے کے لئے کیا کروں"

میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کبھی ادھر دیکھتا کبھی ادھر، جیسے وہ بھاگنے والا ہو مگر وہ وہیں کھڑا رہتا۔ کیونکہ جیسا میرا خیال ہے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ کدھر کو جانا چاہئے۔ تب میں نے نظر ڈالی اور دیکھا کہ ایک شخص جس کا نام خضر تھا۔ اس کی طرف چلا آرہا ہے۔ اس نے آکر پوچھا تو اس طرح کیوں چلا رہا ہے۔

اس نے جواب دیا۔ میرے ہاتھ میں یہ جو کتاب ہے اس سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ مجھے ایک دن مرنا ہے اور اس کے بعد حساب کتاب ہونا ہے اور میں اپنے آپ کو پہلی بات کے لئے تیار پاتا ہوں نہ دوسری کے لئے"

تب خضر نے کہا "تو مرنے پر تیار کیوں نہیں ہے جبکہ دنیا اتنی برائیوں سے بھری ہوئی ہے۔"

آدمی نے کہا "اس لئے کہ میں ڈرتا ہوں۔ یہ بوجھ جو میری پشت پر ہے، مجھے قبر کی گہرائیوں سے بھی کہیں زیادہ نیچے پہنچا دیگا۔ اور میں دوزخ میں گر پڑوں گا۔ اور اگر میں حوالات جاؤں گا تو مجھے عدالت میں بھی پیش ہونا پڑے گا اور سزا بھی سہنی پڑے گی۔ اور انہی کا خیال مجھے رونے چلانے پر مجبور کر رہا ہے۔"

تب خضر نے کہا: "اگر تیری حالت یہی ہے تو پھر تو ایک جگہ کیوں کھڑا ہے؟"

اس نے جواب دیا "یوں کہ مجھے معلوم نہیں کدھر کو جاؤں؟"

تب اس نے اسے ایک گول لپٹا ہوا موم زدہ کاغذ دیا۔ اور اس کے اندر یہ لکھا ہوا تھا "آنے والے غضب سے ڈرو۔"

پھر خضر نے اپنی انگلی سے ایک بہت وسیع میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تجھے سامنے چھوٹا سا دروازہ نظر آتا ہے؟"

آدمی نے کہا "نہیں۔"

اس پر خضر نے کہا "تجھے سامنے روشنی چمکتی نظر آتی ہے؟"

اس نے کہا "ہاں میرے خیال میں، روشنی ہے۔"

تب خضر نے کہا "اس روشنی پر نظر جمائے رکھ اور اس کی طرف سیدھا چلا جا۔ اس طرح تجھے دروازہ نظر آ جائے گا۔ جس پر جب تو دستک دے گا، تجھ سے یہ کہا جائے گا کہ تجھے کیا کرنا ہوگا۔" پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ آدمی بھاگنے لگا۔ ابھی وہ اپنے گھر کے دروازہ سے زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ مگر بیوی بچوں نے یہ دیکھ کر اسے واپس لانے کے لئے شور مچانا شروع کر دیا۔ مگر آدمی نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور یہ چلاتا ہوا دوڑا۔ "زندگی! زندگی! غیر فانی زندگی!" پھر اس نے پیچھے پھر کر نہیں دیکھا بلکہ میدان کے وسطی حصہ کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

پڑوسی بھی اسے دوڑتا دیکھنے نکل آئے۔ اور جوں جوں وہ دوڑتا کوئی مذاق اڑاتا۔ کوئی ڈراتا۔ کوئی واپس آنے کے لئے چلاتا۔ اور ان لوگوں میں جو اسے روک رہے تھے دو ایسے بھی تھے جنہوں نے زبردستی اسے بھاگ کر پکڑ لانے کا ارادہ کیا۔ ایک کا نام اصرار تھا دوسرے کا نرم دل۔ اس وقت تک آدمی ان لوگوں سے خاصے فاصلہ پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن بہر کیف انھوں نے اس کا پیچھا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور اس پر عمل بھی کیا۔ اور تھوڑی دیر میں اسے جا لیا۔ تب آدمی نے کہا "پڑوسیو! تم کس لئے آئے ہو؟"

انھوں نے کہا "تمھیں واپس ساتھ لے چلنے کے لئے۔"

لیکن اس نے کہا "ایسا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔"

اس نے کہا "تم لوگ خراب آباد میں رہتے ہو جہاں میں بھی پیدا ہوا تھا میں دیکھتا ہوں۔ اور وہاں مرنے کے بعد دیر سے یا سویرے، تم قبر سے بھی زیادہ گہرائی میں پھینک دیئے جاؤ گے۔ ایسی جگہ جو پتھر کے ایندھن سے جل رہی ہوگی۔ ذرا سوچو۔ اچھے پڑوسیو! اور تم بھی میرے ساتھ چلے آؤ۔"

اصرار نے کہا "اور اپنے دوستوں کو اپنی راحتوں کو پیچھے چھوڑ دیں؟"

محمد مسلم نے جو اس آدمی کا نام تھا کہا "ہاں۔ کیونکہ جو کچھ تم چھوڑو گے اس کی قدر و قیمت اس شے کے ادنےٰ سے حصے کے مقابلے میں بھی کچھ نہیں جس کا طالب میں ہوں۔ اور اگر تم میرے ساتھ آؤ گے تمھیں بھی اس سے نوازا جائے گا۔ اس لئے کہ جہاں میں جا رہا ہوں وہاں کسی شے کی کمی نہیں۔ آؤ اور میرے الفاظ کی سچائی کو آزما کر دیکھو۔"

اصرار نے کہا "وہ کیا چیزیں ہیں جن کے تم طالب ہو۔ اور ساری دنیا کو ان کے پیچھے چھوڑ رہے ہو؟"

مسلم نے کہا "میں ایسی شے کا طالب ہوں جو نہ خراب ہونے والی ہے۔ نہ گلنے سڑنے والی ہے۔ نہ کبھی گھٹنے والی ہے۔ اور وہ جنت میں ہے۔ ایک مقررہ دن ان لوگوں کو عطا کی جائے گی۔ جو اس کے طالب ہیں۔ لو اگر دیکھو تو میری اس کتاب میں اسے پڑھ لو۔"

اصرار نے کہا "ہشت! دفعان ہو اپنی کتاب کے ساتھ! ہمارے ساتھ تم واپس چلو گے یا نہیں؟"

مسلم نے کہا "نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ اب تو قدم اٹھ چکا ہے

ہوگا جو کچھ ہونا ہوگا، کر بھی چکے اب عزم سفر ہم
کانٹوں پر بھی سونا ہوگا، ہوں گے خاکِ راہ گذر ہم"

اصرار نے کہا "اچھا تو بھائی نرم دل آؤ۔ لوٹ چلیں۔ اور اس کے بغیر ہی گھر کی راہ لیں۔ سر پھروں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ جب ان کے دماغ میں ایک خیال گھس گیا تو پھر نکالے نہیں نکلتا۔ اور اپنے سوا کوئی عقلمند ہی نہیں رہتا ان کے نزدیک۔"

اس پر نرم دل بولا "برا بھلا کیوں کہتے ہو۔ اگر جو کچھ مسلم کہتا ہے۔ سچ ہے تو اس کی مطلوب شے ہماری چیزوں سے اچھی ہے۔ میرا دل تو اپنے

پڑوسی کے ساتھ جانے کو کہتا ہے؟"

احرار نے جل کر کہا "کیا؟ تم ایک اور بیوقوف نکلے! میرا کہو مانو اور پیچھے لوٹ جاؤ۔ کون جانے یہ دماغی مریض تمھیں کدھر لے جائے۔ لوٹ جاؤ! لوٹ جاؤ! اور عقلمند بنو!"

مسلم بولا "نہیں بلکہ تم بھی اپنے پڑوسی نرم دل کے ساتھ ساتھ آؤ۔ وہاں ایسی ایسی چیزیں ملیں گی۔ میں نے ابھی تمھیں بتائی ہیں اور اس کے علاوہ اور کتنی ہی بہترین چیزیں۔ تمھیں مجھ پر یقین نہ ہو تو لو اس کتاب میں پڑھ لو۔ اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر یقین کر کے دیکھو ان کے بنانے والے نے خود تصدیق کی ہے۔"

نرم دل نے کہا "اچھا پڑوسی میاں احرار، میں تو ایک نتیجے پر پہونچا ہوں۔ میرا ارادہ اس بھلے آدمی کے ساتھ جانے کا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کے ساتھ وابستہ کرتا ہوں۔ لیکن اچھے دوست کیا تمھیں اس جگہ کا راستہ بھی معلوم ہے؟"

مسلم نے کہا "مجھے ایک آدمی نے راستہ بتایا ہے جس کا نام خضر ہے کہ اس سامنے والے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھنا چاہئے۔ جہاں ہمیں راستے کے بارے میں بتایا جائے گا۔"

نرم دل نے کہا "تب تو آؤ اچھے پڑوسی ہمیں چلنا چاہئے۔"

پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چل دیئے۔

احرار نے کہا "اور میں اپنے گھر واپس چلتا ہوں ایسے گمراہ کن جنونیوں کی دوستی سے بچنا ہی اچھا۔"

پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ احرار تو واپس جانے لگا اور مسلم اور نرم دل آپس میں باتیں کرتے ہوئے میدان کی طرف بڑھنے لگے۔ اور اس طرح گفتگو شروع کی۔

مسلم - آؤ بھائی نرم دل۔ کہو کیسے مزاج ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرے ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ اگر احرار بھی میری طرح آنے والی مصیبت کے خوف کو محسوس کر سکتے۔ تو یوں کبھی پیچھے نہ لوٹتے۔"

نرم دل - "آؤ بھائی مسلم۔ اب مجھے اور تفصیل سے بتاؤ وہ چیزیں کیا ہیں۔ اور ہمیں کیسے مل سکتی ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

مسلم - میں ان کا تصور کچھ ذہن میں ہی زیادہ اچھا کر سکتا ہوں۔ زبان سے ادا ہونا مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی کیونکہ ہماری دونوں کی خواہش ہے اس لئے میں اپنی کتاب میں سے پڑھتا ہوں۔

نرم دل - اور تمھیں اس کا یقین ہے کہ کتاب میں حرف بحرف صحیح لکھا ہے؟

مسلم - ہاں۔ بالکل۔ اس لئے کہ کتاب اس کی ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

نرم دل - ٹھیک کہا۔ تو وہ چیزیں کیا ہیں؟

مسلم - وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی بادشاہت ہوگی۔ جس میں ہم رہیں گے۔ اور ہمیں ابدی زندگی بخشی جائے گی۔ تاکہ ہم اسی بادشاہت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں۔

نرم دل - خوب۔ اور کیا؟

مسلم - ہمارے چہرے نیکی کے نور سے منور ہوں گے۔ اور لباس سورج کی طرح چمکتا ہوا ہوگا۔

نرم دل - خوب اور کیا ہوگا؟

مسلم - وہاں آہ و زاری نہیں ہوگی۔ نہ کوئی غم رہے گا کیونکہ وہ جو اس جگہ کا مالک ہے ہماری آنکھوں میں آنسو نہیں رہنے دے گا۔

نرم دل - اور وہاں کیسی صحبت ملے گی؟

مسلم - وہاں فرشتے ہوں گے جو بہت اچھی مخلوق ہیں۔ اور ہم میں سے جو ہزاروں لوگ گذر چکے ہیں وہاں ملیں گے۔ ان میں سے کوئی شر پسند نہیں ہوگا۔ سب محبت اور نیکی کو پسند کرنے والے ہوں گے۔ ہر ایک خدا کے سامنے ہوگا اور اس کے جلوہ سے فیض یاب ہوگا۔ مختصر یہ کہ وہاں ہمارے بزرگ مردوں اور پاکباز عورتوں کو عزتیں بخشی جائیں گی۔ اور وہ لوگ جنھیں دنیا میں بڑی بڑی مصیبتیں اپنے حقیقی مالک کی محبت کی خاطر اٹھانی پڑی ہیں۔ کبھی کبھی انھیں آرے سے چیرا گیا ہے۔ کبھی آگ میں ڈالے گئے ہیں۔ کبھی درندوں کی غذا بنائے گئے ہیں۔ کبھی سمندروں میں ڈبوئے گئے ہیں۔ ان سب پر خدا کی لازوال رحمتیں سایہ کئے ہوئے ہوں گی۔

نرم دل - اتنا ذکر ہی دل موہ لینے کے لئے کافی ہے۔ مگر کیا ان چیزوں کو استعمال کرنے کا ہمیں حق ہوگا۔ ہم ان میں اپنا حصہ کیسے پائیں گے؟

مسلم - اس جگہ کے حاکم نے اس کتاب میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہمیں سچے دل سے ان چیزوں کی طلب ہوگی۔ تو بے حساب ہمیں بخشی جائیں گی۔

نرم دل - بہت خوب اچھے دوست۔ مجھے ان چیزوں کا حال سنکر خوشی ہوئی۔ آؤ۔ اپنے قدم ذرا تیز کر دیں۔

مسلم - میں اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتا جتنا میں چل رہا ہوں۔ میری پیٹھ پر ایک بھاری بوجھ ہے۔

اب میں نے خواب میں دیکھا کہ ٹھیک جیسے ہی انھوں نے یہ بات چیت

ختم کیا۔ وہ ایک بڑی دلدل کے قریب پہونچ گئے تھے۔ یہ دلدل میدان کے وسط میں تھی۔ اور بے خبری میں اچانک دونوں دلدل میں گر گئے۔ دلدل کا نام "بیدلی" تھا۔ یہاں ایک مدت تک وہ کیچڑ میں پڑے لڑھکتے رہے۔ اور مسلم اپنی پشت کے بھاری بوجھ کی وجہ سے اس میں دھنسنے لگا۔

تب نرم دل نے کہا: "آہ۔ پڑوسی میاں مسلم۔ اب تم کہاں ہو؟"

مسلم نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

اس پر نرم دل لڑنے کو تیار ہو گیا اور غصہ میں اپنے اس ساتھی سے کہا۔ "یہی وہ خوشی ہے جس کا تم ذکر کرتے چلے آئے ہو اگر ہمارے سفر کی ابتدا یہ ہے تو ابتدا سے انتہا تک ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اب کسی طرح میری زندگی بچ جائے تو وہ جگہ تم اکیلے ہی اپنے قبضے میں رکھنا۔ میں باز آیا۔"

اور یہ کہہ کر ایک دو بار اس نے بیدلی کے عالم میں سخت کوشش کی اور دلدل سے نکل کر اس کنارے پر پہونچ گیا جو اس کے گھر کی طرف تھا اور واپس چلا گیا۔

اس کے بعد مسلم "بیدلی" کی دلدل میں لڑھکتا اکیلا رہ گیا اور یہ شعر پڑھنے لگا:

گھبرا گئے ہیں بیدلی ہمرہاں سے ہم
اپنا سا عشق، درد میں لائیں کہاں سے ہم

لیکن کوشش کا دامن اس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ برابر دلدل کے اس کنارے پر پہونچنے کی کوشش میں لگا رہا جو اس کے گھر سے دور اور خضر کے بتائے ہوئے چھوٹے دروازے کی طرف تھا۔ مگر وہ دلدل سے نکل نہیں سکا۔ کیونکہ اس کی پشت پر جو بوجھ تھا وہ مزاحم ہو رہا تھا۔

لیکن میں نے خواب میں دیکھا کہ اس کے پاس ایک آدمی جس کا نام نصرت تھا۔ آیا اور اس نے پوچھا: "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

مسلم نے کہا: "مجھے اس راستہ پر چلنے کو ایک آدمی نے کہا تھا جس کا نام خضر ہے۔ اسی نے سامنے والے دروازے کی طرف جانے کو کہا تھا تاکہ میں آنیوالے عذاب سے بچ سکوں اور میں ادھر ہی جا رہا تھا کہ یہاں اس دلدل میں گر پڑا۔"

نصرت نے کہا "لیکن تم دیکھ کر نہیں چلے۔"

مسلم نے کہا: "خوف میرا اس قدر پیچھا کر رہا تھا کہ میں دوسرے راستہ پر آگیا اور گر پڑا۔"

نصرت نے کہا: "لاؤ مجھے اپنا ہاتھ دو۔"

اور مسلم نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ نصرت نے اسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اور وہ پکی زمین پر لے آیا۔ اور پھر اس سے اپنی راہ لینے کو کہا۔

تب میں آگے قدم بڑھا کر اس آدمی کے پاس پہونچا جس نے اسے باہر نکالا تھا۔ اور کہا: "جناب! چونکہ خراب آباد سے سامنے والے دروازے تک جانے کا راستہ اس جگہ سے گذرتا ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دلدل پاٹ دی جائے تاکہ مسافر حفاظت سے گذر سکیں؟"

اس نے مجھ سے کہا "یہ دلدل پاٹنا ممکن نہیں ہے۔ یہ وہ نشیبی علاقہ ہے جہاں گناہ کی ساری آلودگیاں مسلسل بہتی ہیں۔ اسی لئے اسے بیدلی کی دلدل کہا جاتا ہے۔ گنہگار کو جب اپنی پچھلی حالت کا احساس ہوتا ہے۔ تو اس کے دل میں بہت سے شکوک، خوف اور ہمت شکن خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اور یہ آلودگیاں مل کر اس جگہ بیٹھ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جگہ اتنی خراب ہے۔

اس جگہ کو بادشاہ نہیں چاہتا کہ یہ جگہ ایسی ہی خراب رہے۔ اس کے نوکروں نے اسے پاٹنے کی کوششیں کی ہیں اور ایسی کوششیں صدیوں سے ہزارہا برس سے ہو رہی ہیں مگر دلدل ختم نہیں ہوتی۔

سچ تو یہ ہے کہ خدا نے اس دلدل میں بھی گذرنے کا راستہ رکھا ہے۔ جو آج کل گندگی زیادہ ہونے اور موسم خراب ہونے کی وجہ سے مشکل ہی سے نظر آ سکتا ہے۔ لوگ ڈرا گھبرائے اور ان کے قدم دلدل میں دھنسے۔ مگر جب وہ ایک بار پار کر کے نکل جاتے ہیں تو آگے زمین اچھی ملتی ہے۔

اب میں نے خواب میں دیکھا کہ اس وقت نرم دل واپس اپنے گھر پہونچ چکا تھا اور اس کے ہمسائے اسے دیکھنے آئے تھے۔ کسی نے اسے واپس آنے پر عقلمند کہا۔ کسی نے مسلم کے دھوکہ میں آجانے پر بیوقوف کہا۔ باقی کچھ لوگ اس کی بزدلی کا مذاق بھی اڑا رہے تھے کوئی کہتا "جب تم نے اس کے ساتھ جانے کی ہمت کی تھی تو لوٹے کیوں۔ میں ہوتا تو ہرگز مشکلات سے گھبرا کے ساتھ نہ چھوڑتا اور اتنی گراوٹ کا ثبوت نہ دیتا۔"

اس طرح نرم دل ان کے درمیان بیٹھا سنتا رہا لیکن آخر کار اس نے کچھ اعتماد حاصل کر لیا۔ سب لوگ بیٹھ گئے اور اسے چھوڑ کر بے چارے مسلم کو اس کی پیٹھ پیچھے برا بھلا کہنے لگے۔

اور اب جبکہ مسلم سیدھا اپنے راستہ پر چلا جا رہا تھا۔ اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو میدان پار کرتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ یہ ذاتِ شریف جو اس سے ملے عاقل صاحب نام کے تھے اور خواجہ دنیا پرست لقب تھا۔ اور جس شہر کے رہنے والے تھے۔ اس کا نام دنیا پرستی تھا۔ جو بہت بڑا اور شاندار شہر تھا۔ اور مزاج کی حالت یہ تھی ؎

الٰہی کونسی منزل ہے یہ دنیا پرستی کی
کسی نے نام پوچھا اور سجدہ کر لیا میں نے

یہ آدمی مسلم سے ملا۔ اور اس کے بارے میں اندازہ لگانا چاہا۔ کیونکہ مسلم کے خراب آباد سے چلے آنے پر آس پاس کی بستیوں میں یہ خبر تیزی سے پھیل گئی تھی۔ اور ایک عجیب غلغلہ برپا تھا۔ خواجہ دنیا پرست نے اسے اتنی محنت اٹھا کر چلتے دیکھ کر اور اس کی آہ وزاری سے کچھ اندازہ لگایا کہ یہ وہی شخص ہے۔ اور اس سے بات چیت شروع کی۔

خواجہ دنیا پرست ۔ کہو اچھے دوست کہاں جا رہے ہو ان بوجھل قدموں کے ساتھ۔

مسلم ۔ بوجھل قدموں کے ساتھ! تم نے ٹھیک کہا۔ مگر پوچھو تو جہاں تک میرا خیال ہے اس بے بس آدمی کے پیچھے ہمیشہ سے لگا رہا ہے۔ اور تم یہ جو پوچھتے ہو کہ کہاں چلا۔ تو میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میں سامنے والے چھوٹے دروازے کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں جیسا مجھے بتایا گیا ہے۔ مجھے بوجھ سے چھٹکارا ملنے کا راستہ معلوم ہو جائے گا۔

خواجہ دنیا پرست ۔ اگر میں تمھیں نصیحت کروں تو مانوگے؟

مسلم ۔ ہاں اچھی ہوئی تو مانوں گا۔ مجھے اچھی صلاح کی ضرورت ہے۔

خواجہ دنیا پرست ۔ تب میں تمھیں صلاح دوں گا کہ جلد جلد اس بوجھ سے اپنا پیچھا چھڑاؤ۔ اس وقت تک تمھارا ذہن کبھی یکسو نہیں ہو سکے گا۔ نہ تم خدا کی ان نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہو جو اس نے عطا کی ہیں۔

مسلم ۔ یہی تو میں چاہتا ہوں اور بوجھ سے پیچھا چھڑانا بھی۔ مگر خود کیسے چھڑاؤں۔ یہ بات میرے بس میں نہیں۔ اور نہ کوئی دوسرا کندھوں سے اسے اتار سکتا ہے۔ یہ بوجھ ہی ایسا ہے۔ اس لئے میں ادھر جا رہا ہوں جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا تاکہ اس سے چھٹکارا پاسکوں۔

خواجہ دنیا پرست ۔ تمھیں کس نے بتایا ہے کہ ادھر جانے سے چھٹکارا مل جائے گا۔

مسلم ۔ ایک آدمی نے جو صورت سے بہت معزز اور بزرگ معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کا نام جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ خضر ہے۔

خواجہ دنیا پرست ۔ بُرا ہو اس کا اور اس کی صلاح کا۔ تمھیں اس نے وہ خطرناک اور مصیبت بھرا راستہ بتایا ہے جس سے بڑھ کے دنیا میں کوئی راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تمھیں آپ پتہ چل جائے گا اگر تم نے اس کی بات پر عمل کیا۔ اور غالباً کوئی نہ کوئی واقعہ بھی تمھارے ساتھ ضرور پیش آچکا ہے۔ اسلئے کہ تمھارے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو رہے ہیں۔ مگر یہ دلدل تو مصیبت کی ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ میری بات مانو میں تم سے بڑا ہوں اور زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ اس راستے میں جس پر تم جا رہے ہو۔ تمھیں تھکن۔ درد۔ فاقہ۔ کپڑوں کی تنگی، تلوار، شیر، اژدہے، اندھیرے، اور مختصر یہ کہ موت کا سامنا ہوگا۔ یہ چیزیں تمھیں ضرور ملیں گی۔ تم سے پہلے کتنے لوگوں کو پیش آچکی ہیں۔ ایک اجنبی کے کہنے پر اتنی مصیبتوں کو ڈھونڈنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

مسلم ۔ کیسے؟ میں یہ بات کیسے مان سکتا ہوں۔ یہ بوجھ جو میری پشت پر ہے ان سب مصیبتوں سے زیادہ ہولناک ہے جو تم نے بتائی ہیں۔ نہیں نہیں۔ مجھے قطعی اس کی پرواہ نہیں کہ رستے میں کیا ملے گا۔ اور ملے بھی تو بوجھ سے نجات حاصل کرنے کے لئے مجھے سب گوارا ہے۔

خواجہ دنیا پرست ۔ تمھیں اس بوجھ کا احساس کیسے ہوا؟

مسلم ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے جو میرے ہاتھ میں ہے۔

خواجہ دنیا پرست ۔ یہی میں سوچ رہا تھا۔ آخر تمھارے ساتھ وہی ہوا جو اور دوسرے کمزور طبیعت کے لوگوں کے ساتھ ہو چکا ہے کہ وہ اپنی بساط سے کہیں زیادہ اونچی چیزوں کی طلب میں پھنس گئے اور ذہنی پراگندگی مول لے لی۔ جس نے نہ صرف انسانی مقتضیات کو بھلا دیا۔ بلکہ ایسی موہوم امیدوں کے پیچھے دوڑایا جن کا انھیں ٹھیک علم بھی نہیں تھا۔

مسلم ۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا ملے گا۔ مجھے بوجھ کی تکلیف سے آرام ملے گا۔

خواجہ دنیا پرست ۔ لیکن تم آرام کی تلاش اس راہ میں کیوں کر رہے ہو جس میں اتنے بہت سے خطرے نظر آرہے ہیں۔ اگر تم صبر کے ساتھ میری بات سنتے تو میں تمھیں بتاتا کہ جو چیز تم حاصل کرنا چاہتے ہو وہ بغیر ان خطروں کے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ بالکل آسان علاج ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ تمھیں خطروں کے بجائے میرے بتائے ہوئے راستہ میں حفاظت و آرام حاصل رہے گا۔

مسلم ۔ تو پھر مہربانی کر کے یہ بھید مجھ پر کھولو۔

خواجہ دنیا پرست ۔ دیکھو سامنے والے گاؤں میں — گاؤں کا نام اخلاق آباد ہے — ایک شریف آدمی قانون پسند نام کا رہتا ہے۔ جو بہت کام کی قسم کا ہے۔ اور نام بھی اچھا سا ہے۔ اور اسے ایسے بوجھ سے نجات دلانے میں مہارت بھی ہے جیسا تمھاری پیٹھ پر ہے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نے اس راہ میں بڑی شہرت پیدا کی ہے اور اس کے علاوہ جن لوگوں کی ذہنی حس بوجھ سے کچل جاتی ہے اور وہ خبطی ہو جاتے ہیں انھیں بھی اچھا کر دیتا ہے۔ تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے مدد لو۔ اس کا گھر یہاں سے کوئی میل بھر ہوگا۔ اتنا سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اور گھر پر اگر وہ نہیں ہوگا تو اس کا لڑکا ملے گا۔ جو ایک خوبصورت نوجوان ہے اور اس کا نام تہذیب پسند ہے۔ وہ بھی اپنے بوڑھے باپ کی طرح

ھاری مدد کر سکتا ہے۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ وہاں تمھیں ضرور آرام ملے گا۔ اور رنج و غم کے اس بوجھ سے نجات حاصل کر لو گے۔ اور اگر تم اس کے بعد اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہو اور میری خواہش تو یہی ہے کہ یہ جانا، تو ایسا ہو سکتا ہے کہ تم اپنے بیوی بچوں کو اس سامنے والے گاؤں میں بھیج دینا۔ جہاں بہت سے مکانات خالی پڑے ہیں۔ ایک نہ ایک تمھیں معقول کرایہ پر مل ہی جائے گا۔ ضروریات کا سامان وہاں سستا اور اچھا ملتا ہے۔ اس طرح تمھاری زندگی زیادہ خوشی سے کٹے گی اور یقیناً وہاں ایماندار، نہایت مہذب اور معزز قسم کے پڑوسی ہوں گے۔

اب مسلم ٹھٹک کر سوچنے لگا تھا۔ لیکن فوراً وہ اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ اگر یہ باتیں ٹھیک ہیں جو اس بھلے آدمی نے بتائیں تو عقلمندی اسی میں ہے کہ میں اس کی صلاح مان لوں۔ اور اس نے یہ سوچ کر اس آدمی سے کہا۔

"اس آدمی کے گھر کا راستہ کونسا ہے؟

خواجہ دنیا پرست - سامنے والی پہاڑی دیکھ رہے ہو تم؟

مسلم - ہاں، صاف نظر آ رہی ہے۔

خواجہ دنیا پرست - اس پہاڑی کی طرف چلے جاؤ اور سب سے پہلا گھر جو تمھیں ملے بس اسی کا ہے۔

پھر مسلم قانون پسند کے گھر مدد چاہنے کو جانے کے لئے اپنے راستہ سے مڑا اور چل دیا مگر دیکھو جب وہ پہاڑی کے بالکل نزدیک پہونچ گیا تو وہ اتنی اونچی معلوم ہوتی تھی اور جدھر کو راستہ جا رہا تھا اس طرف ایسی آگے کو نکلی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا اب گری۔ اب گری۔ مسلم کو آگے بڑھنے میں بہت خوف معلوم ہوا کہ کہیں پہاڑی اس کے سر پر نہ آ گرے۔ تب وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ اور عجیب حیرت کی حالت میں پھنس گیا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس کا بوجھ بھی اب پہلے کی بہ نسبت زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ اور پہاڑی سے آگ کی لپٹیں بھی آ رہی تھیں۔ جس سے مسلم کو ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں جل نہ جائے۔ یہاں وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اور خوف سے تھرانے لگا۔

جہاں دل زار مچلا رہ پائی۔ خرد نے گمراہ کر کے چھوڑا
مسافر خستہ دل کو مصروفِ نالہ و آہ کر کے چھوڑا

(باقی)

تنگ کمرہ

بقیہ صفحہ ۴۰

ڈارنی اسٹیشن کے باہر صبح کو تفریحی سفر کے روز کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس نے اس کے باوجود کہ اس کی مونچھیں داڑھی صفا چٹ تھی اس کو پہچان لیا تھا اور ادھر دوسری طرف اس کی مالکہ مکان نے زینہ پر چڑھتے ہوئے اس کی بڑبڑاہٹ اور گھبراہٹ کو سن لیا تھا۔ حالانکہ اس کی آواز دھیمی تھی۔ وہ اس کی جستجو میں پڑ گئی اور دلچسپی لینے لگی۔ اور کسی قدر خوفزدہ بھی ہو گئی۔ اور فطرتاً اس نے اپنے دوستوں سے تذکرہ کیا۔ اور اس طرح معاملہ پولیس کے کان تک پہونچ گیا۔ اور پولیس نے ساکن کے ورود کی تاریخ پوچھی۔ یوں پتہ لگ گیا۔ اور اب وہ گمنام شخص گرم چائے پیتے ہوئے، مکھن گوشت صاف کرتے ہوئے اور انڈوں سے اپنی معمولی اشتہا کو دور کرتے ہوئے۔ یہاں تنگ کوٹھری میں خوشگوار کامدگی دیواروں کے درمیان موجود ہے۔ یا پھر یوں کہئے ذلیل قید خانہ میں۔

گناہ کسی نہ کسی صورت سے دل کو بے چین رکھتا ہے ——— عثمانؓ

اے، سی، وارڈ
مترجم —— ادارہ معیار

شا کے انقلاب انگیز ڈرامے

نصف صدی تک برطانیوں کا یہ طے شدہ خیال رہا کہ برنارڈ شا انقلاب پسند ہے لیکن کسی کو واضح طور سے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی جس میں وہ انقلاب لانا چاہتا تھا۔ اپنے زمانے کے سماجی اور سیاسی نظریات پر اس کا اثر یقیناً اہم تھا۔ اگرچہ اس کی گیرائی اور گہرائی کا اندازہ ممکن نہیں تھا اس لئے کہ اس کی سرحدیں بیسویں صدی کی ذہنی فضا میں گم ہو گئی تھیں اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس حد تک جدید عصری انقلابات کی تہہ میں شا کے اضافوں کی جھلکیاں موجود تھیں۔ یہاں مختصراً بحث و نظر کو ڈرامہ کی دو صورتوں تک محدود رکھا جا سکتا ہے۔ جو انقلاب انگیز اثرات کا سبب بنیں۔ ایک اسٹیج اور دوسرے کتابی صورت میں پیش کئے ہوئے ڈرامے۔

ادب کے طالب علموں کو اس فارمولے سے کبھی نہ کبھی واسطہ ضرور پڑتا ہے کہ "Drama is conflict" یعنی ڈرامہ کی جان کشاکش اور ستیزہ کاری ہے۔ شا کے ڈراموں پر جو تنقیدیں کی گئی ہیں ان میں سے بیشتر اسی مفروضہ پر مبنی ہیں کہ اس کے ڈرامے کشاکش سے خالی ہیں۔ اگر ڈرامہ میں کشاکش کا مطلب لازماً جسمانی عمل کا شدید اظہار اور کشت و خون ہونا یا جذباتی ہیجان ہی ہے۔ تب تو واقعی شا کے ڈرامے اس لحاظ سے کشاکش سے عموماً خالی ہیں۔ کشاکش کا یہ فقدان شا نے ارادتاً پیدا کیا ہے اور اس کی جگہ ذہنی عمل کو دی ہے۔ جو شا کی نظر میں زیادہ خیال انگیز تھا۔ جذباتی کشاکش کی جگہ شا نے خیال اور عقیدہ کی کشاکش کو رکھا ہے۔ یا یوں کہئے کہ جسمانی اور حسی جذبات کی پرانی چودھراہٹ کو ختم کرنے کے لئے شا نے اخلاقی میلانات کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کا ڈرامہ ایک مفکر کا ڈرامہ ہے جو جنس پرستوں کے ڈرامے کو چیلنج کرتا ہے۔ جس صحیح قسم کے انقلاب کا سہرا شا کے سر ہے وہ جدید ڈرامہ میں جسمانی کشاکش کے بجائے ذہنی کشاکش کو جگہ دینے کا انقلاب ہے۔ بحث و نظر شا کے تمام ڈراموں کی اصل ہے۔ سامعین اس کی دلیلوں سے اس کی تیز طرار ذہانت اور بہت گہرے قسم کے مزاح سے مبہوت ہو کر اس ذہنی کشمکش میں گم ہو جاتے ہیں جو نظریوں اور انسانی قدروں کے عام معیاروں پر تنقید اور ان کے تضاد کے اظہار کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ یہی چیز ڈرامہ کے مواد کو مقبول ترین۔ جاذب توجہ اور تفریح آمیز بناتی ہے۔

دوسرے انقلابوں کی طرح یہ انقلاب بھی ایک ردِّ عمل اور نشاۃ جدیدہ تھا۔ تمام اعلیٰ پایہ کے ڈراموں میں اور خصوصاً یونانی اور الزبتھ کے دور کے کلاسیکل ڈراموں میں خیالات کی باہم آویزش اہم ترین مقام رکھتی ہے۔ بہرکیف شا کے ڈراموں میں کوئی شدید قسم کا ایسا ٹکراؤ نہیں پایا جاتا جو المیہ شعری کارناموں کی طرح کلائمکس پیدا کر سکے۔ شا نے ایسے عہد میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی جبکہ یہ محسوس ہو چلا تھا کہ دلائل آدمی کا سب سے کامیاب ہتھیار بننے والے ہیں۔ اس وقت کسی برطانی کو اس کا یقین نہیں ہو سکتا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط تک "انٹی گون" کے المیہ سانحے، کتھ ڈیڈا کی گھریلو مصیبتوں سے زیادہ اس کے قریب آ جائیں گے۔

جب برنارڈ شا نے تھیٹر پر اپنی توجہ منعطف کی تو وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھا کہ اس کی تنگ نظریاں کس حد تک اس کے مقصد میں حائل ہوں گی۔ تھیٹر میں اسے سامعین کی اس تعداد سے زیادہ سابقہ پڑا جس سے وہ مقرر کی حیثیت سے پہلے متعارف ہو چکا تھا۔ تاہم جیسا کہ چند برس بعد اس نے Unpleasant Plays کے دیباچے میں کہا۔ اس وقت انگریز تھیٹر جانے کی عادت کو بھلا چکے تھے۔ اس وقت جو لوگ اس مشغلے کو جاری رکھے ہوئے تھے وہ کچھ زیادہ فکر انگیز اور سماجی شعور کے حامل نہیں تھے۔

اس عالم میں شا نے اپنے سامعین کی تعداد بڑھانے کی غرض سے اپنے ڈراموں کو کتابی شکل میں چھاپنا شروع کر دیا۔ لیکن پبلک صرف تھیٹر ہی سے کم دلچسپی نہیں رکھتی تھی، بلکہ ڈرامے پڑھنے کی تو فیق بھی نہیں تھی۔ کیا یہ پبلک کا قصور تھا؟ یا ایسا محض اس لئے تھا کہ ڈرامے اس وقت ایسے انداز میں

ھا پہچانتے کہ پڑھنے والے انھیں حوصلہ شکن سمجھنے پر مجبور ہوتے؟ شانے سوچا کہ قصور پبلک کی بہ نسبت، انداز ترتیب اور طرز طباعت کا زیادہ تھا۔ اسٹیج پر پیش کئے جانے والے ڈراموں میں وہ پہلے ہی ایک انقلاب لا چکا تھا۔ اب اس نے ڈراموں کی ترتیب اور انداز طباعت میں بھی ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس وقت تک ڈرامے کتابی شکل کے ڈراموں سے قطعاً مختلف تھے۔ پہلے پہل تو کاپی رائٹ محفوظ کرنے کی آسانیاں ہی نہیں تھیں بعد میں ہوئیں بھی تو لوگوں میں اس کی پابندی کم تھی۔ اس لئے مصنف اور ایکٹر اس خیال سے باضابطہ مسودے شائع کرنے پر رضامند نہیں ہوتے تھے کہ کہیں دوسرے لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھالیں۔ ممکن تھا کہ لوگ تھیٹر جانے کے بجائے ڈرامہ پڑھنے ہی پر اکتفا کرلیں۔ انیسویں صدی میں انگلینڈ میں بے شمار ڈرامے کتابی شکل میں نکلے لیکن اکثر و بیشتر بہت سستے اور بدنما تھے اور نہایت خراب کاغذ پر بھدے ٹائپ اور غیر موزوں کور کے ساتھ چھپتے تھے۔ علاوہ ازیں اس بات کی کوشش بہت کی جاتی تھی کہ پڑھنے والوں کو اسٹیج اور اداکاری کے سلسلے میں مصنف کا نظریہ معلوم ہو سکے۔

ڈرامہ پڑھنے کے لئے پڑھنے والوں کے اندر قوت تخیل کی ضرورت ہے جس کی مدد سے اور ڈرامہ نگار کے بتائے ہوئے اشارات کے سہارے وہ اپنے ذہن میں ڈرامہ کو اسٹیج کر سکیں۔ شیکسپیئر کے عہد سے ۱۸۹۰ء تک انگریز مصنفوں کے چھپے ہوئے ڈراموں میں صرف اسٹیج کے غلط سلط مکالمے اور اسٹیج کی ہدایات محض اداکاروں کے لئے ہوتی تھیں جو EXIT اور ENTRANCE جیسے چند لفظوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ منظر کشی۔۔ روکلام یا کسی وقتی ضرورت کے لئے شاذ ہی کوئی لفظ بول دیا جاتا تھا۔ شانے اپنے ڈراموں میں توضیحی اور تشریحی نوٹوں کا اضافہ کیا۔ منظر کشی کا بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ حق ادا کیا تاکہ ڈراموں کے پڑھنے والوں کو کردار اور ان کے عمل اور ماحول کو ذہن میں تازہ کرنے میں آسانی ہو سکے اور وہی تاثر اور فضائیت قائم ہو سکے جو مصنف چاہتا تھا۔

Unpleasant Plays کے دیباچہ میں شا خود کہتا ہے "یہ فیصلہ ایک نئے آرٹ کے اسکول کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اور میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دو کتابوں[۱] کے چھپنے کے دس برس کے اندر ہی اندر وہ سب اعتراض جو ان پر کئے جاتے ہیں کہیں پیچھے رہ جائیں گے" یہ پیشگوئی بالکل ٹھیک نکلی۔

J. M. Barrie نے جب اپنے ڈرامے ۱۹۱۸ء[۲] میں شائع کئے تو ان میں مکالمے اور توضیحی نوٹ ساتھ ساتھ پیش کئے گئے تھے۔ اس دوران میں شا کے اس طرز کو ڈرامہ نگاروں نے اپنا لیا اور ڈرامے پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی۔ اگر PINERO کے ڈرامہ The Second Mrs. Tanqueray (شائع شدہ ۱۸۹۵ء) کے متن کا موازنہ شا کے ۱۸۹۸ء کے ڈراموں سے کیا جائے تو شا کے طرز کی امتیازی خصوصیتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ شا کا پہلا چھپا ہوا ڈرامہ "رنڈوؤں کی بستی" (Widower's Houses) ہے جس کا انڈیپنڈنٹ تھیٹر ایڈیشن ۱۸۹۳ء میں نکلا تھا۔ کوئی ایسا توضیحی اور بیانیہ مواد نہیں ہے جیسا کہ پانچ برس بعد اس نے خود پیش کیا۔ "انسان اور فوق الانسان" (Man and Superman) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود شا نے ۱۹۰۳ء تک چھپے ہوئے ڈراموں میں انقلاب لانے کی کوششوں میں کہاں تک ترقی کی۔

آخر میں یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ شا نے شروع ہی سے اپنی کتابوں کے ٹائپ، کاغذ، اور جلد پر گہری نظر رکھی۔ جیمس شینڈ نے شا کی کتابوں کی چھپائی کی ایک پوری تاریخ تفصیل سے پیش کی ہے۔ اس کی کتابوں میں کہیں کہیں ذوقی رجحان کی مبالغہ آمیز شدت بھی ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتابیں بہترین ترتیب اور تدوین کے سلیقے سے مزین ہیں۔

برنارڈ شا کی توافق پسند صلاحیتوں کا اظہار اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پرنٹروں کو ۱۸۹۵ء سے اور پبلشروں کو ۱۹۰۳ء سے موت کے وقت تک جو ۱۹۵۰ء میں ۲ نومبر کو ہوئی۔ ردوبدل کی تکلیف کبھی نہیں اٹھانی پڑی۔ یہ غالباً اپنی نوعیت کی ایک ہی مثال ہے۔

۱؎ Play Pleasant and Unpleasant (1898)

۲؎ 'The Admirable Crichton' ملاحظہ ہو۔ جو پہلے پہل ۱۹۱۴ء میں شائع کیا۔

اُس پار

جمیل الاحمد معظم آبادی

زندگی اور موت کے درمیان ایک اتھاہ سمندر حائل ہے ———

اور . . . .

اُمیدوں کی کشتی یکہ و تنہا طوفانی موجوں کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے ———

آگے . . . . .

عمیق سمندر کی نیلی چادر حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی ہے ———

کیا دُنیا کی وسعت یہیں ختم ہو جاتی ہے ؟

آسماں کے گہرے نیلگوں پردے پر لرزتے ہوئے ستاروں کے لاتعداد موتی چمک رہے ہیں ———

آندھی اور طوفان کے جھکڑ۔ بادل کی گرج۔ بجلی کی چمک اور یہ بھیانک سیاہ رات ———

اِن سب کی تخلیق ہمارے اور صرف ہمارے لئے ہے ———

شمعِ حیات گل کرنے کے لئے ———

سنو ! ہماری موت پر . . . . . .

دُور بہت دُور بانسری کے سینے پر پھیلے ہوئے لاتعداد ناسوری زخموں سے۔

باگیشوری راگ کے حزینہ بول فضا میں کراہ رہے ہیں۔

گھٹائیں اشک بار ہو گئیں اور اُن کے سوگوار آنسو دُور تک پھیلی ہوئی زمین کے وسیع دامن پر ٹپک رہے ہیں۔

کس نے محبت کا حسین کاجل ہماری آنکھوں سے چُرا لیا ؟

کس کے دل نواز فریب کے خلد آفریں سایہ میں سورج کی روشنی پہلی بار اچھی لگی تھی۔

سیندور کے رنگ میں ڈوبے ہوئے چمپئی کے موتیوں کا ہار نقلی معلوم ہوتا ہے۔

خوشیوں سے بھری ہوئی رنگین اور تابناک دنیا ہماری مایوس نگاہوں میں تاریک ہو گئی ہے ———

مٹی اور پانی کے خمیر سے تیار کیا ہوا رنگ رُوپ اور رس بھرا جسم دوسرے جنم کی یادگاریں ہیں۔

جوانی کی بیتی ہوئی یادیں "چتا" میں جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکی ہیں اور اب اُن کا نشان بھی نہیں ملتا ———

"اُس پار" دُور تک پھیلی ہوئی موت سے زیادہ بھیانک خاموشی کہہ رہی ہے ———

" جہاں حُسن و محبت کے خوش آیند نغمے فضا میں گردش لیتے ہیں۔ وہاں آرزو اور تمناؤں کا ماتم بھی ہوتا ہے ———

اے دُنیا ہم تجھے سلام کرتے ہیں۔ آخری سلام۔ ہمیں جلد رخصت کر۔

تیرے بجلی کے قہقہوں میں چھپے ہوئے شہد کے فوارے سے اپنی پیاس بجھا چکے ———

موت مسکرا کر نذرِ عقیدت پیش کر رہی ہے۔

جسم کانپ رہا ہے۔ اور قلب سکون کی انتہائی گہرائی میں ڈوبتا جاتا ہے۔

ہمارے کمزور بازو ڈانڈ چلاتے چلاتے تھک چکے ہیں اور . . .

کشتیٔ حیات ساحل سے ناآشنا موت کے بہاؤ پر چلی جا رہی ہے ———

(بنگالی نظم کا ترجمہ)

خطوط و نکات

وحید علی خاں

معیار کا تازہ شمارہ ملا۔ مسرت کی بات ہے کہ اب معیار پابندی سے نکل رہا ہے۔ تخلیقات کے انتخاب میں آپ نے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ شعری و نثری تخلیقات کافی جاندار ہیں۔ بالخصوص غزل اور غزل "گو" مجھے بہت پسند آیا لیکن بھائی مجھے اس بات کی شکایت ہے کہ اس مرتبہ کے افسانے معیاری نہیں ہیں۔ تجمی کا افسانہ (؟) واقعی ایک سوال بن گیا ہے! اس افسانہ میں ہاشمی معاش کی وجہ سے پریشان و سرگرداں پھرتا ہے پر اسے کچھ نہیں ملتا۔ اور تین دن کا فاقہ ہوتا ہے! اس سلسلہ میں اسے مختلف واقعات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اب افسانہ نگار کے آخری الفاظ ہیں کہ "ایسی کش مکش میں! ایسی حالت میں آپ کیا کرتے؟ ہاشمی نے کیا کیا ہوگا؟؟ آپ بتائیے!" ——— کوئی بتلائے کہ ہم کیا بتلائیں؟! غالباً افسانہ نگار یہاں سماج کے ظلم کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگر ہاشمی کوئی جرم بھی کر بیٹھے تو وہ اسے بھی سماج ہی کے سر تھوپیں گے۔ یہ انداز فکر ٹھیک نہیں! اگر ایک حد تک ٹھیک ضرور ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے فرد پہلے ہے اور سماج بعد میں! فرد کی خامی میں سماج کا حصہ ہوتا ضرور ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں سراسر قصور سماج ہی کا ہو اور فرد "بے گناہ" ہی ہو! یہ تو ہاشمی کی خامی ہے کہ وہ سماج کو اس طرح دیکھ کر ہمت توڑ بیٹھا۔ شاید "جرم" پر بھی اتر آیا۔ اس طرح ہاشمی کا کردار تو یہاں کوئی اثر ہی پیدا نہیں کرتا۔

دوسرے افسانے "روشنی" کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ ہارون رشید صاحب نے اپنے مقصد کو ابھارنے کے لئے غیر فطری اور "جلد باز" طریقہ اختیار کیا ہے! اچانک ماں کی علالت کا تار آنا اور جلدی یہ معلوم ہونا کہ وہ کسی کی دعا سے اچھی ہو گئی ہے ——— پھر آخری گفتگو جبکہ ایک شخص اخبار بیچنے اور ایک برلا کے ملازم کی حیثیت سے ہوتی ہے اور اچانک اس کے قدم مسجد کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان باتوں سے شاید خدا پرستی کے جذبہ کو ابھارنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوئی فکری اور استدلالی انداز نہیں ہے! اس میں آمد سے زیادہ آورد معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کو ایسے انداز سے بچنا چاہئے۔ یہ باتیں کسی کی تنقیص کے لئے نہیں عرض کر رہا ہوں بلکہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ تعمیری ادب کی تحریک پہلے ہی سے اپنی خامیوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔ اور طعنۂ اغیار سے محفوظ رہے ——— آئندہ اگر آپ افسانوی معیار کو اونچا کرنے کی کوشش کریں تو بہتر ہوگا۔

کیف نوگانوی

معیار کے دیرینہ کرمفرماؤں سے کہئے کہ غریب "معیار" کی حالت پر رحم کھائیں۔ آخر یہ بے رخی کیوں؟ اگر "معیار" کو واقعی معیاری مواد مہیا کیا جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ لکھنے والوں کی صلاحیتیں نشو و نما پائیں گی۔ معیار کی اشاعت بڑھے گی۔ جس سے اس کی بنیادیں مستحکم ہوں گی بلکہ ہم اپنے نوخیز ادیبوں کے سامنے بہتر نمونے پیش کرنے اور دیگر ادبی حلقوں پر اثر انداز ہونے کے قابل ہو سکیں گے۔

انور اعظمی، نجات اللہ صدیقی، شمس رحمانی، حسان کیفی، اقبال نسیم وغیرہ تو ادب سے جیسے کنارہ کش سے ہو گئے ہیں۔ انہیں جھنجھوڑئیے۔ ابوالمجاہد زاہد۔ حفیظ میرٹھی، منظر حسین، سہیل زیدی، افتخار اعظمی، ابو خالد ایم اے۔ عروج قادری، عاصی ضیائی ــ ظہیر بجھیروی۔ ثاقب عباسی، اختر علی عابد، طیب عثمانی، اور دیگر اہل قلم حضرات کو اپنی دوہری ذمہ داریوں کا احساس دلائیے تاکہ جمود و تعطل کی کیفیت ختم ہو۔

دوسری چیز جس کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ ہماری نوخیز ادبی تحریک میں عملی تنقید کا فقدان ہے۔ معیار کے تنقید نمبر میں اس ضمن میں جو کوششیں کی گئی ہیں وہ بہت تشنہ ہیں۔ ہمارے تنقید نگاروں کو اس موضوع کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر فوری توجہ دینا چاہئے۔

عبد المغنی

موجودہ ادبیات کے اندر تنگ نظری، فرقہ بندی، سطحیت اور ذریب وفساد کی تاریک فضا میں آپ نے صالح و صحت مند ادب کی جو جوت جگائی ہے۔ وہ یقیناً آج کے ابھرتے ہوئے ادیبوں کے لئے مشعل و معیار کا کام دے سکتی ہے۔ اس عظیم تاریخی کارنامے کے لئے ادارۂ معیار کی خدمت میں اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے میں اس خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے آپ کو اس اہم ادبی و ملی خدمت کی توفیق دی۔

بہرکیف میں آپ کی تحریک سے نہایت متاثر ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی طرف پیش قدمی کی جرأت کر رہا ہوں۔

راہی فیض آبادی

آپ کا پرچہ "معیار" ماہ اپریل کا آج پہلی بار نظر سے گذرا یقین جانئے پڑھکر دل بہت مسرور ہوا میں بے جا تعریف کا عادی نہیں۔ معیار جیسا نام آپ نے رکھا ہے۔ ویسا ہی ہے۔ آپ کا "نقش اول" تو میں نے ابھی پڑھا نہیں۔ صرف نظم "عورت" اور محمد عثمان رمز کا "غزل اور غزل گو" پڑھ سکا ہوں۔ چند اور پرچوں سے مقابلہ کر کے دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ آپ کی درازیٔ حیات کی دعا کرتا ہوں تاکہ زبان اردو کی زلف سنورتی رہے۔ آمین۔

ظہور الحق صدیقی

معیار کے پچھلے شماروں میں رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں بہت کچھ کہا سنا گیا لیکن افسوس ہے کہ اسلام پسند حلقوں پر ایک اسلامی ادب کے علمبردار رسالے کا جتنا حق ہے وہ ادا نہیں ہوا۔ اگر کسی نے کچھ تخفیف کر بھی دی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک دلوں میں اسلامی ادب کی خدمت کی حقیقی لگن موجود نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ دور دراز سے کسی کی مشکلات کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہے۔ اس سلسلے میں ہماری ایجنسیاں بھی بالکل اپاہج ثابت ہو رہی ہیں معاف کیجئے گا۔ اسلامی ادب کی خدمت سے زیادہ انہیں اپنے کاروبار سے مطلب رہتا ہے۔ اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

ایم، احمد مظاہری

آج کل معیار پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ بڑی مسرت ہو رہی ہے لیکن اس مسرت میں میرا بہت ہی کم حصہ ہے۔ میں نے تو صرف ایک ہی خریدار آپ کو دیا ہے، مزید خریداروں کے لئے کوشاں ہوں۔

اس بے سروسامانی کے عالم میں آپ معیار کے لئے جس ہمت و جرأت کا ثبوت دے رہے ہیں وہ حقیقتاً ہم سب لوگوں کے لئے باعث تقلید ہے۔

خیال اپنا اپنا

مسعود عالم نمبر

ماہنامہ ـ چراغ راہ ـ کراچی

یہ نمبر ہند و پاکستان کی ایک نہایت محترم ادبی شخصیت کی یاد میں نکالا گیا ہے۔ جسے مسعود عالم ندوی مرحوم کے لائق و فائق شاگرد محمد عاصم صاحب نے نعیم صدیقی صاحب کے ساتھ مل کر ترتیب دیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ دونوں صاحب اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ایک طرف اگر ایک ایسے واقف اور باخبر شخص کی آگہی اور دل سوزی ہے جو مسعود عالم مرحوم کے سفر اور حضر کا رفیق ایک مدت تک رہا ہے تو دوسری طرف نعیم صدیقی کی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال نظر آتے ہیں جس کا اولین اظہار اور اولیں ثبوت لفظی تصویر ہے جو نعیم صاحب کے خیال انگیز قلم کا رہینِ منت ہے۔

مسعود عالم ندوی کی ذات اپنے گہرے مطالعہ عربی ادب پر عبور اور شگفتہ اردو عربی تحریر کے ساتھ ساتھ جس خلوص اور دینی جذبہ کی حامل تھی وہ بلاشبہ اس لائق تھی کہ اس دورِ قحط الرجال میں دوسروں کے لئے ایک سبق کا کام کرتی۔ اس قابلِ قدر فرض کو انجام دینے کی سعادت چراغِ راہ کے حصہ میں آئی جس پر ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اپنے آپ کو عمر کے ہر حصہ میں اتنا سنبھالے رکھنا جتنا مسعود عالم ندوی نے سنبھالے رکھا۔ محنت سے تحریر پر اتنا عبور حاصل کر لینا کہ عربی اہلِ زباں کے ہم پلہ قرار پانا اور اس کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب اور سیاست میں اتنی گہری واقفیت حاصل کرنا ______ وہ خصوصیات ہیں جن سے مسعود عالم ندوی کی شخصیت کی تعمیر ہوئی۔ یہ خصوصیات اس نمبر کے مقالوں سے بخوبی واضح ہوتی ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور محمد عاصم صاحب کے مقالے دوسرے مقالات سے زیادہ معلومات افزا ہیں۔ جن دیگر مقالات میں مسعود عالم مرحوم کے طرزِ تحریر کا جائزہ فنی نقطۂ نظر سے لیا گیا ہے۔ وہ بھی خوب ہیں۔

مہ پارہ ـ (ناول) ـ

مصنف :ـ نسیم انہونوی ـ

ملنے کا پتہ :ـ ماہنامہ حریم لکھنؤ ـ

"مہ پارہ" ایک اصلاحی ناول ہے جس میں مصنف نے اسلامی معاشرے کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا موضوع اودھ کے عقد بیوگان اور بازارِ حسن کی ہلاکت آفرینی ہے۔ اہم کردار اسلامی اصول و فکر کا چلتا پھرتا نمونہ نظر آتے ہیں۔ ایک شخص اسلامی افکار کو پھیلانا اپنا مشن قرار دیتا ہے اور زندگی بھر اس کے لئے طاغوتی اصولوں اور ہتھکنڈوں سے لڑتا رہتا ہے۔ ایک آن کو بھی اس کے پائے استقلال کو جنبش نہیں ہوتی۔ اور آزمائشوں کو خندہ پیشانی سے انگیز کئے چلا جاتا ہے۔

اس ناول میں جن لوگوں کو اسلام اپناتا دکھایا گیا ہے وہ اندر آکر خود اس معاشرہ میں بہت سی خرابیاں پاتے ہیں جو ان کو ایک بری راہ پر لے جاتی ہیں۔

آج کے معاشرہ کا یہ تجزیہ مصنف نے درست ہی کیا ہے۔ اس تجزیہ میں اگرچہ اسلام کی انقلابی اسپرٹ موجود ہے لیکن رواجی تصور سے دھندلی پڑ جاتی ہے۔ اگر اس کی ہمہ گیری اور اجتماعیت کو اور نکھار کر پیش کیا جاتا تو اصلاحی پہلو اور نمایاں ہو سکتا تھا۔ غرض کہ ہمیں اس ناول میں اصلاحی نقطۂ نظر کی جھلکیاں شروع سے آخر تک ملتی ہیں اور ساتھ ہی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔

ایک کردار البتہ ایسا ہے۔ جس کا تجزیہ مصنف نے پوری گیرائی سے کرنے پر توجہ نہیں دی اور وہ غلام رسول کا کردار ہے۔ جو ایک نومسلم کی حیثیت سے مسلم معاشرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور جلد ہی بعض سماجی خرابیوں کے سبب سے انتقامی جذبہ بیدار ہو جانے پر قتل کے جرم میں کالے پانی چلا جاتا ہے۔ اور ناول ایک انقلاب پسند کردار کے پورے تجزیہ سے محروم رہ جاتا ہے۔

مگر یہ محرومی ان چیزوں کے مقابلے میں بہت کم ہے جو ناول اپنے پڑھنے والوں کو دیتا ہے۔